غلام رسول مہر
مالک رام
عبادت بریلوی
مختار الدین احمد
جگن ناتھ آزاد
عطا کاکوی

۵۰ نئے پیسے

غالب نمبر

فروری ۱۹۵۸ء
ماگھ - پھاگن شک سمت ۱۸۷۹

اردو کا مقبول عوام مصوّر ماہنامہ

آج کل

دہلی

ترتیب

مجلسِ ادارت

محمد مجیب	جامعہ ملیہ دہلی
محی الدین قادری زور	حیدرآباد
گوپی ناتھ امن	دہلی
خواجہ احمد فاروقی	دہلی
رحمان راہی	سری نگر

یو ایس موہن راؤ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن

بال مکند عرش ایڈیٹر شعبۂ اردو سیکرٹری
(مدیر مشاورتی)

سالانہ چندہ:- ہندوستان میں:- چھ روپے
پاکستان میں:- چھ روپے (پاک)
غیر ممالک سے:- نو شلنگ یا ایک ڈالر

فی پرچہ:- ہندوستان میں:- ۵۰ نئے پیسے
پاکستان میں:- آٹھ آنے (پاک)

جلد ۱۶ — نمبر ۷

سرورق:- غالب نامہ اردو نام و نشان نمبر میں

فروری ۱۹۵۸ء

ماگھ پھاگن شک سمت ۱۸۷۹

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
بال مکند عرش ملسیانی ایڈیٹر "آج کل" اردو، اولڈ سیکرٹریٹ دہلی

مرتبہ و شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ حکومت ہند

پبلیکیشنز ڈویژن پوسٹ بکس ۲۰۱۱ دہلی

آج کل

اہلِ نظر کی نظر میں

"آج کل آج کل خوب نکل رہا ہے۔ بخصوص موسیقی نمبر تو ایسا نکلا کہ ہند و سندھ کا کوئی ادبی رسالہ اب تک ایسا نمبر پیش نہیں کر سکا۔ کیا باعتبار مواد اور کیا بلحاظ تاریخِ فن۔ یہ ترتیب کا کمال ہے۔ خدا آپ لوگوں کا حامی ہو۔ آپ حقیقت میں زبانِ اردو کے محسن ہیں۔"
(عبدالمجید سالک)

"آج کل ان رسالوں میں ہے جو ہر طبقے کے پڑھنے والوں کے لئے کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان ضرور مہیا کرتے ہیں۔ رسالے کی ادبی حیثیت بہت اچھی ہے۔ اس کے مقالے اور نظمیں بیشتر معیاری ہوتی ہیں۔ ظاہری حسن یعنی کاغذ، چھپائی اور تصویروں کے اعتبار سے کوئی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"
(مسعود حسن رضوی)

"آج کل کا موسیقی نمبر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس فن پر خصوصی نمبر کا لانا آسان بات نہ تھی۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو جمع و ترتیبِ مضامین میں کن کن صبر آزما منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ آپ کے ذوق و انتخاب دونوں کی داد دیتا ہوں۔"
(نیاز فتحپوری)

"میں آج کل کو ہمیشہ بہت دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ اس میں اکثر قابلِ قدر مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ علاوہ معنوی خوبیوں کے یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ ہمیشہ خوبی اس کی لکھائی اور چھپائی وغیرہ بھی خوش مذاقی کا ثبوت دیتی ہیں۔ ہمارے بہت سے رسالے تو اس ظاہری حسن سے بھی عاری ہیں۔"
(غلام السیدین)

"رسالہ آج کل علمی، لسانی اور ملکی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد بلند ہیں۔ رسالے کی حیثیت محض ہندوستانی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ میں قدر یا کتب خانے میں اس رسالے کے شمارے مجلد شکل میں محفوظ ہوں، وہاں تشنگانِ علم و ادب برابر اپنی پیاس بجھا سکتے ہیں۔"
(فراق گورکھپوری)

"آج کل کا بجا طور پر اردو کے بہترین رسالوں میں شمار ہے۔ اس کے بیشتر مضامین نو بہ نو مفید اور دلچسپ معلومات سے لبریز ہوتے ہیں۔ گھٹیا قسم کے بیہودہ افسانوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے۔ نظم کے حلقے میں بھی ایک امتیازی شان ہوتی ہے۔"
(اثر لکھنوی)

"آج کل اردو کے ان چند مقبول رسالوں میں ہے جو ہر ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے عام نمبروں میں علاوہ معلوماتِ عامہ پر مفید مضامین کے ادبی تخلیقیں اور تنقید بھی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور اس میں جتنا یہ نظموں اور پڑگیٹ غزلوں کا بھی ایک گلدستہ ہوتا ہے۔"
(آل احمد سرور)

"آج کل نے تھوڑے ہی دنوں میں لوگوں کو بہت متاثر اور متوجہ کر لیا ہے۔ اچھے ادبی اور تنقیدی مضامین تو اس میں شائع ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اکثر ایسے علمی، تہذیبی، فنی اور معلوماتی مضامین بھی نکلتے ہیں جو دوسرے رسائل میں نظر نہیں آتے۔ اس کا یہ تنوع ہی اسے ہر دل عزیز بناتا ہے۔"
(احتشام حسین)

فی پرچہ آٹھ آنے	بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سیکرٹریٹ دہلی	سالانہ چھ روپے

ملاحظات

غالب

ہم ہر سال فروری میں غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور آجکل کا غالب والا رسالہ یہ رسالہ بلکہ ماہ بماہ اس کے سوانح اور کلام پر روشنی ڈالتے ہیں۔ غالب کی شوخی اور دلچسپی اس کی انفرادیت اور تخلص اس کی معنی آفرینی اور شیریں ادا پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ہمارے خیال میں غالب کی اولوالعزمی خودداری اور پامردی کا کما حقہ اعتراف نہیں ہو سکا ہے۔ غالب کی زندگی ایک جہدِ مسلسل رہی ہے۔ جب وہ پانچ برس کے تھے تو یتیم ہو گئے۔ چچا نے جو نواب احمد بخش والیِ فیروزپور کے بہنوئی تھے مرزا نوشہ اور مرزا یوسف کی پرورش اپنے ذمہ لی۔ غالب آٹھ برس کے ہوئے تو چچا کا انتقال ہو گیا۔ انگریزی سرکار نے چچا کی جاگیر لے لی اور ورثا کی پچیس ہزار سالانہ کی مالگزاری معاف کر دی تاکہ اس سے غالب اور ان کے بھائی کو دس ہزار روپیہ سالانہ ملتا رہے۔ چند مہینوں بعد نواب احمد بخش نے کچھ ایسا داؤ کیا کہ انگریزی حکام نے وہ رقم گھٹا کر ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ کر دی یعنی غالب کو ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ کی بازیافت رہ گئی۔

تیرہ برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ غالب جب تک آگرے میں رہے دیگر رؤسا کی طرح وہ بھی لہو و لعب اور رنگ رلیوں میں مشغول رہے۔ پچیس برس کے سن تک یہ شوق قائم رہا پھر طبیعت اعتدال پر آ گئی۔ البتہ شراب کی لت اور جوئے کا چسکا پڑ چکا تھا۔

شادی کے بعد مرزا غالب آگرے سے دلّی آ گئے اور ان کی مالی اور ذہنی پریشانیوں کا دور شروع ہوا۔ ۱۸۲۲ء میں نواب احمد بخش خاں نے اپنی حیات ہی میں جائداد اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دی۔ غالب کی رقم اُن کے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں سے متعلق تھی جو غالب سے خوش نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے تو روپیہ ادا کرنے میں حیلے روڑے اٹکائے اور آخر ۱۸۳۱ء میں روپیہ بھیجنا بالکل بند کر دیا۔ خدا کی کرنی کہ ۱۸۳۵ء میں شمس الدین خاں کو ایک انگریز افسر فریزر کے قتل کرانے کے الزام میں پھانسی ہو گئی اور ۱۸۳۶ء میں غالب کو چار برس کا بقایا بھی وصول ہو گیا۔ مگر اسی دوران میں جوان بھائی مرزا یوسف مصیبتوں سے عاجز آ کر دیوانہ ہو گیا۔

غالب نے ایک بار پھر کوشش کی کہ ان کی آمدنی دس ہزار سالانہ ہو جائے چنانچہ اسی زمانے میں دلی سے کلکتے کا سفر کیا۔ کلکتے کی عدالت نے کہا کہ یہ مقدمہ دلّی کی عدالت میں دائر ہونا چاہئے چنانچہ غالب تین برس بعد کلکتے سے دلّی واپس آ گئے۔ آخر جون ۱۸۳۶ء میں مقدمہ غالب

کے خلاف فیصلہ ہوا۔ گورنر جنرل سے اپیل کی، فیصلہ خلاف رہا۔ ولایت میں اپیل کی۔ ۱۸۴۲ء میں وہاں سے بھی خلاف فیصلہ آ گیا اس پر بھی ہمت نہ ہاری اور نہ کوشش ترک کی۔ ملکہ وکٹوریہ سے اپیل کی۔ ۱۸۴۴ء میں وہاں سے دامنِ مراد پُر نہ ہوا۔

۱۸۵۰ء سے غالب کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جب کہ انھوں نے بیوی کے طعنوں سے عاجز آ کر نوکری کی ذلت برداشت کرنا قبول کی۔ قلعہ میں سلسلہ جنبانی ہوئی اور بہادر شاہ ظفر نے ان کو فارسی میں خاندانِ تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا۔ تنخواہ پچاس روپیہ ماہوار تھی۔ ۱۸۵۴ء میں ولی عہد بہادر مرزا فخرو شاگرد ہوئے اور استاد کو چار سو روپیہ سالانہ دینے لگے اور حضرت واجد علی شاہ نے بھی پانچ سو روپیہ سالانہ مقرر کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ غالب کے دن پھر گئے۔ لیکن توبہ کیجئے غالب کی قسمت میں فراغت کہاں۔ دو برس بعد مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا۔ واجد علی شاہ تخت سے اتار دئے گئے۔ خضر سلطان کو ہڈسن نے گولی مار دی۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ تھا اور بے تاج ظفر رنگون سدھار رہے تھے۔ ہنگامہ شروع ہوتے ہی غالب کی بیوی نے اپنا تمام زیور میاں کالے صاحب کے مکان پر بھیج دیا کہ وہاں محفوظ رہے گا۔ وہ سب لٹ گیا۔ دیوانہ بھائی مرزا یوسف بھی مر گیا۔ پنشن تو بند ہونا ہی تھی اور یہی اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ مرزا غالب نے اگر انگریزوں کی مخالفت نہیں کی تو ان کی حمایت بھی نہیں کی، بلکہ ان پر یہ تو الزام لگا کر "ایام غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے۔"

نواب رام پور نے ۱۸۵۹ء سے ہی جو ماہانہ مقرر کر دیا تھا آخر غالب ۱۸۶۰ء میں رام پور چلے گئے۔

۱۸۶۵ء میں نواب کلب علی خاں کی تاجپوشی کا جشن تھا۔ غالب رام پور گئے۔ دلّی واپس آ رہے تھے۔ مرادآباد کے پاس راستے میں کشتیوں کا پُل ٹوٹا ہوا تھا جیسے ہی غالب کی پالکی اس پر پہنچی پُل بہہ گیا۔ ملازم اور دوسرے ساتھی اس پار رہ گئے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ غالب نے مرادآباد کی سرائے میں رات بسر کی۔ رات بھر جاڑے کے بخار نہ اُٹھا سکے۔ جاڑا، بڑھاپا اور کمزوری۔ آخر بیمار ہو گئے اس کے بعد پھر صحت گرتی گئی۔ دوسرے سال اپنی بیماری کے حال میں لکھتے ہیں:

"اعصاب کے ضعف کا یہ حال ہے کہ اٹھ نہیں سکتا اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر چارپایہ بنتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں ......

ایک سو ساٹھ روپیہ کی آمد۔ تین سو روپیہ کا قرضہ۔ کہو زندگی دشوار ہے کہ نہیں۔"

اس دشوار زندگی کے باوجود غالب کی یہ آن قائم رہی کہ چاہے وارہ ہو یا دیر کعبہ، خاص کر ہار سے رکھتے۔ عزت میں پاس وضع کا یہ حال تھا کہ دلّی کالج میں نوکری کے لئے گئے اور پرنسپل نے باہر نکل کر استقبال نہ کیا تو واپس چلے آئے۔ وظیفہ کی طلب میں پنشن وہ اس لئے نہیں کہ وہ وظیفہ کے قائل تھے اور اس کے لئے انگریزوں کی خوشامد پر تیار تھے بلکہ اس لئے کہ ان کی جائیداد کا روپیہ تھا اور وہ اپنے حق کے لئے لڑ رہے تھے —— غالب کی خودی، خودداری اور اُن کی مسلسل جد و جہد کی یہ روشن مثال ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی

دسمبر ۱۹۵۷ء میں قوم اور قلم کے پجاریوں کو تین صدمے پیش آئے۔ شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی کی وفات۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ مؤلف تاریخ ادبِ اردو اور پنڈت ہری چند اختر کا انتقال۔

وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک بیان میں یاد دلایا کہ مولانا مدنی بچپن ہی میں اپنے والد کے ساتھ مدینہ چلے گئے تھے اور وہیں فارغ التحصیل ہو کر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ پہلی جنگِ عظیم کے ایام میں جب شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی حجاز تشریف لے گئے تو مولانا مدنی ان کے شاگرد ہو گئے اور ان کے ساتھ رہنے لگے۔ ان دونوں کی انگریز دشمنی مشہور تھی۔ چنانچہ حجاز کے شریف حسین نے دونوں کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیا جنھوں نے انھیں مالٹا میں قید کر دیا۔ جنگ کے ختم ہونے پر مولانا محمود الحسن اور مولانا مدنی کو ہندوستان واپس آنے کی اجازت ملی اور پھر ۱۹۲۱ء میں جیل گئے۔ اس وقت سے اب تک یعنی ۳۶ برس تک مسلسل اس جماعت میں شریک رہے جس کا نصب العین ہندوستان کو فرنگی سے آزاد کرانا تھا۔ جب بھی کانگریس نے ملک کی آزادی کی جدوجہد کی دعوت دی مولانا نے اس پر لبیک کہا۔ ۱۹۴۶ء میں جب مسلم لیگ کے فرقہ وارانہ نعروں نے بہت سے مسلمانوں کو متزلزل کر دیا اس وقت بھی مولانا مدنی ایک پہاڑ کی طرح ثابت قدم پر قائم رہے اور اپنے عزم مستحکم سے دوسروں کا دل بڑھاتے رہے۔

وزیر اعظم نے ایک تعزیتی پیغام میں کہا کہ ان کی موت ایک ایسے عالم اور وطن پرست کی موت ہے جس نے جنگِ آزادی میں ہماری رہنمائی کی۔

غلام رسول مہر

پنج آہنگ

پنج آہنگ مرزا غالب کے کلیاتِ نثرِ فارسی کی پہلی کتاب ہے جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول مکتوب نگاری کے القاب و آداب۔ حصہ دوم فارسی زبان کے مصادر، مصطلحات اور لغات۔ حصہ سوم مرزا غالب کے دیوان سے منتخب اشعار جنہیں مختلف مطالب کے لئے مکاتیب میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حصہ چہارم مختلف کتابوں کے لئے تقریظیں اور عام تحریریں۔ حصہ پنجم مرزا کے فارسی مکاتیب۔

اس کتاب کے ابتدائی تین آہنگوں یا حصوں کا آغاز ۱۸۲۵ء میں ہوا تھا۔ جب انگریزوں نے بھرت پور کے خلاف یورش کی تھی اور اس یورش میں نواب احمد بخش خاں والیٔ فیروز پور جھرکہ کی فوج بھی شامل تھی۔ مرزا غالب اور ان کے برادرِ نسبتی مرزا علی بخش خاں بھی نواب احمد بخش خاں کے ساتھ بھرت پور گئے تھے۔ معلوم ہے کہ مرزا کو عسکری معاملات سے براہِ راست کوئی دلچسپی نہ تھی۔ غالباً وہ اس زمانے میں فیروز پور جھرکہ گئے ہوں اور مرزا علی بخش کے اصرار پر محض سیر و تفریح کے خیال سے معیت اختیار کرلی ہو۔ آگرہ جانا چاہتے ہوں اور فوج کے ساتھ بھرت پور چلے گئے۔ پھر آگرہ ہوتے ہوئے دلی آئے۔

بھرت پور پر یورشیں

میرے نسخۂ پنج آہنگ کے دیباچے میں اسے ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۵ء) کا واقعہ قرار دیا ہے جب ۱۸۲۵ء میں بھرت پور کے خلاف انگریزوں نے مشہور مہم یورش کی، پہلی مرتبہ سر ڈیوڈ آکٹرلونی جنہیں ہندوستانی لونی اختر لونی کہتے تھے، کے زیرِ اہتمام ہوئی تھی۔ اس یورش کو لارڈ ایمہرسٹ گورنر جنرل نے منسوخ کر دیا۔ آکٹرلونی مستعفی ہو کر میرٹھ پہنچ گیا اور وہیں تھوڑی مدت بعد اس نے وفات پائی۔ چارلس مٹکاف کے زیرِ اہتمام دسمبر ۱۸۲۵ء میں دوبارہ یورش کی گئی اور ۱۸ جنوری ۱۸۲۶ء کو بھرت پور کا فیصلہ ہو گیا۔ اس یورش کا سالار کامبرمیر تھا۔ مرزا غالب کے بیان سے واضح ہے کہ وہ پہلی یورش میں نہیں بلکہ دوسری یورش میں فوج کے ساتھ گئے تھے، اس لئے کہ پہلی یورش ۱۸۲۵ء میں ہو چکی تھی۔

پہلے تین حصے

مرزا فرماتے ہیں کہ اس یورش میں میرزا علی بخش خاں اور میں ہم سفر تھے۔ ایک جگہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ علی بخش خاں نے فرمائش کی کہ مکتوب نگاروں کے لئے ایک ایسا دستور العمل تیار کر دیا جائے جس میں متعارف القاب و آداب درج ہوں۔ ساتھ ساتھ مختلف مضامین میں مکاتیب کی مناسبت کے مطابق شکریہ، شکوہ اور شادی و غم کے متعلق موزوں فقرات لکھ دئے جائیں۔

اگرچہ مرزا کی طبیعت اور ذوق کو اس فرمائش سے چنداں مناسبت نہ تھی لیکن علی بخش خاں کے پاسِ خاطر سے وہ ایسا مجموعہ لکھنے کے لئے تیار ہو گئے اور تین روز میں آہنگِ اول پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ دوسرے اور تیسرے آہنگ کی ترتیب میں بھی زیادہ وقت صرف نہ ہوا ہوگا۔ آہنگِ سوم میں مرزا نے جن اشعار پر جو عنوان لکھ دئے ہیں ان سے اشعار کے مطالب و معانی کا زیادہ سے زیادہ اندازہ ہو سکتا ہے۔

ترتیبِ کتاب میں رخنہ

تسخیرِ بھرت پور کے بعد کتاب کی ترتیب رک گئی۔ مرزا غالب کو خاندانی پنشن کے متعلق چارہ جوئی کے لئے کلکتہ جانا پڑا۔ نواب احمد بخش خاں ریاست

۱۸۲۷ء میں دربار اپنے فرزندِ اکبر نواب شمس الدین احمد خاں کے حوالے کر کے قطب صاحب میں گوشہ نشین ہو گئے اور ۱۸۲۷ء میں واصل بحق ہوئے۔ نواب شمس الدین احمد اور خاندان کے دوسرے افراد کے درمیان شرعی تنازعات کا آغاز ہوا۔ مرزا علی بخش خاں دہلی سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ وہ پہلے لکھنؤ پھر جے پور چلے گئے لیکن اطمینان کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ مدت تک ناکامی میں بسر کی۔

۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو دلی کا انگریز ریزیڈنٹ ولیم فریزر مارا گیا۔ اس قتل کے الزام میں نواب شمس الدین احمد خاں بھی ماخوذ ہوئے اور انہیں ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔

تکمیلِ ترتیب

یہ ہنگامہ ہو چکا تو علی بخش جے پور سے دلی پہنچے۔ اس زمانے میں مرزا غالب کا فارسی دیوان "میخانۂ آرزو" کے نام سے مرتب ہو چکا تھا۔ اور مرزا نے اس کے آغاز و اختتام کی نثریں بھی لکھ دی تھیں جو اب مطبوعہ فارسی کلیاتِ نظم میں موجود ہیں۔ علی بخش خاں نے یہ نثریں مرزا سے طلب کیں۔ پھر انہیں خیال پیدا ہوا کہ مرزا کی تمام فارسی نثریں بھی اکٹھی کی جائیں۔ حکیم رضی الدین حسن خاں بھی اس مقصد کا مرکز گرداں رہے اور اس کی تحریک فرماتے رہے۔ میر محمد حسین خاں نثر خوانی میں علی بخش خاں کے ہم سبق رہ چکے تھے۔ انھوں نے بھی نثروں کی فراہمی پر زور دیا۔ علی بخش خاں کو یہ خیال بھی ہوا کہ مرزا غالب کی فارسی تحریرات جمع ہو جائیں گی تو غلام فخرالدین خاں (ابن علی بخش خاں) ان کے مطالعے سے فائدہ اٹھا سکے گا۔ یوں کتاب کی ترتیب از سرِ نو شروع ہو گئی۔

دو چھاپے

غرض جستہ جستہ متفرق نثریں جمع ہو گئیں۔ جن سے آہنگِ چہارم تیار ہوا۔ مرزا کے بھیجے فارسی مکاتیب کی نقلیں مہیا ہو سکیں، انھیں آہنگِ پنجم میں رکھ دیا گیا۔ اس طرح زیادہ تر علی بخش خاں کی فرمائش اور کوشش سے اس کتاب کی تدوین کا سروسامان ہوا جس سے ہم بنام "پنج آہنگ" متعارف ہیں۔ لیکن تدوین کے بعد بھی کم و بیش بارہ تیرہ سال تک اس کی طباعت و اشاعت کا بندوبست نہ ہو سکا۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۰ رمضان ۱۲۶۵ھ (۳۰ اگست ۱۸۴۹ء) کو قلعۂ معلیٰ کے مطبع سلطانی میں چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کے چار سو تراسی صفحے تھے اور چار روپے قیمت رکھی گئی تھی۔ تصحیح و طباعت کا اہتمام حکیم غلام نجف خاں نے اٹھایا تھا۔ اس اشاعت کے کسی نسخے کا اب تک علم نہ ہو سکا۔ دوسری مرتبہ منشی فداالدین نے اسے اپنے مطبع دار السلام (واقع حوض قاضی) میں چھپایا۔ یہ چھاپا ۱۸۵۳ء کا واقعہ ہے۔ اس چھاپے کا ایک نسخہ رام پور کے کتب خانے میں اور ایک نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔

ناقص اور غلط

ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ پہلی مرتبہ "پنج آہنگ" کتنی چھاپی گئی تھی۔ قیاس یہ ہے کہ پانسو سے زیادہ نسخے طبع نہ ہوئے ہوں گے۔ تاہم یہ نسخے باوجود گراں قیمت تین سال میں فروخت ہو گئے۔ لہٰذا اسے دوسری مرتبہ چھاپنے کی نوبت آئی۔ غالب ہے اس وقت تک مرزا کے پاس مزید فارسی خطوط فراہم ہو گئے ہوں اور پنج آہنگ کے دوسرے چھاپے کی ضخامت کسی قدر بڑھ گئی ہو۔

مرزا نے اردو مکاتیب میں ان طباعتوں کا ذکر متعدد بار کیا ہے۔ وہ صاحب عالم مارہروی کو ۱۸۵۳ء میں لکھتے ہیں کہ جو چھاپے کی پنج آہنگ اب چھپ گئی ہیں اور معیوب و معیب ہیں۔ اول تو یہ کہ بعد انطباع نثر جو کچھ تحریر ہوا وہ ان میں نہیں۔ دوسرے غلط بے حد ہیں۔

> کاپی نویس نے وہ اصلاح میری نثر کو دی ہے کہ میرا جی جانتا ہے۔ اگر کہوں کوئی سطر غلطی سے خالی نہیں تو اغراق ہے۔ بے مبالغہ یہ ہے کہ کوئی صفحہ اغلاط سے خالی نہیں۔

اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ شاید حکیم غلام نجف خاں نے تصحیح کا پورا اہتمام نہ کیا۔ لیکن مرزا [illegible] کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> پنج آہنگ تم نے مول لی؟ چھپ گیا۔ دو چھاپے ہیں: ایک بادشاہی چھاپہ خانے اور ایک منشی فداالدین کے چھاپہ خانے کا۔ پہلا ناقص ہے اور دوسرا سراسر غلط ہے۔

ظاہر ہے کہ جو کتاب مطبع سلطانی میں چھپی تھی، اس میں غلطیاں نہ تھیں۔ البتہ مکاتیب کم تھے یا جو نثریں ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۳ء کے درمیان لکھی گئیں یا فراہم ہوئیں وہ اس میں شامل نہ تھیں۔ اس کے خلاف مطبع دار السلام کا نسخہ بہت غلط چھپا تھا۔

پنج آہنگ کا اشتہار

پہلی طباعت کا اشتہار دہلی کے ایک اخبار "فوائد الناظرین" میں ستمبر ۱۸۴۹ء کو چھپنے سے پہلے چھپا تھا۔ اسے بطور تبرک ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"فارسی و اردو زبان کو مژدہ ہو کہ ان دنوں میں مجموعہ نثر ہائے
رنگا رنگ مسمّٰی بہ پنج آہنگ از تصانیفِ فصیح الفصحا و ابلغ البلغا
حضرت مولانا جناب مرزا اسد اللہ خاں بہادر مدظلہ بہ تصحیح و
ترتیب والا شان، عالی خاندان، عظیم الفخر، جسیم الاحسان ظفر آثار
حکیم غلام نجف خاں بہادر بیچ مطبع سلطانی کے طبع ہو کر تیار ہے
اور وہ کتاب کاغذ ولایتی پر بہت خوشخط نستعلیق چھپی ہے

اور صفحے اس نسخۂ دلپذیر کے ۱۴۳ ہیں۔ قیمت اس کی
چار روپے مقرر ہے۔ جس کسی صاحب کو خریداری اس کتاب
کی منظور ہو ایک درخواست بیچ اردو اخبار کے نزد جناب حکیم صاحب
ممدوح یا نزد خاکسار ارسال فرماویں، کتاب مذکورہ فوراً ارسال خدمت
ہوگی۔"

خاکسار سے مقصود "فوائد الناظرین" کا ایڈیٹر ہے۔

محمد غفران الرحمٰن خاں نشا

قدم بڑھا کے چلو

اے رنگ و روئے زمانہ نکھارنے والو
تمام جگ کا مقدّر سنوارنے والو
بنامِ شوق دلوں کو اُبھارنے والو
چلو چلو یہ نئی جنّت کے گُن دکھا کے چلو
قدم ملا کے چلو، حوصلے بڑھا کے چلو

بڑھو بلند ارادوں کی روشنی لے کر
پیامِ امن و اماں، صلح و آشتی لے کر
ہر ایک سمت چلو جوششِ زندگی لے کر
رہِ حیات کو قدموں سے جگمگا کے چلو
قدم ملا کے چلو، حوصلے بڑھا کے چلو

تمھیں ملال نہ ہو اجنبی فضاؤں کا
کرو نہ خوف کبھی آفتوں بلاؤں کا
چلو تو ایسے کہ رُخ موڑ دو ہواؤں کا
مصیبتوں پہ کھلے دل سے مسکرا کے چلو
قدم ملا کے چلو، حوصلے بڑھا کے چلو

دلوں میں شمعِ یقین و عمل جلاتے ہوئے
قدم قدم پہ نئے ولولے جگاتے ہوئے
اندھیری شب میں اُجالوں کے گیت گاتے ہوئے
چلو قدم کو ذرا تیز تر اُٹھا کے چلو
قدم ملا کے چلو، حوصلے بڑھا کے چلو

یہ لطف و عیش کی خاطر دکھاوا کیا معنی
گھنیری چھاؤں میں لمبا پڑاؤ کیا معنی
جو سب ہیں ایک تو پھر بھید بھاؤ کیا معنی
بچھڑ گئے ہیں جو ان کو گلے لگا کے چلو
قدم ملا کے چلو، حوصلے بڑھا کے چلو

گرے ہوئے ہیں جو پیچھے انھیں اُٹھانا ہے
تمام بگڑے نصیبوں کو پھر بنانا ہے
یہ مرحلے ہیں کٹھن ان کے پار جانا ہے
کمالِ شوق یہی ہے کہ سر اُٹھا کے چلو
قدم ملا کے چلو، حوصلے بڑھا کے چلو

عبادت بریلوی

غالب کے تغزّل کا سماجی پہلو

غالب نے اپنے آپ کو خود اپنی شکست کی آواز کہا ہے۔ وہ "گلِ نغمہ" اور "پردۂ ساز" نہیں تھے۔ حالاں کہ انھیں اس بات کی تمنّا تھی۔ وہ اسی کی آرزو کرتے رہے۔ اُن کی تمنّا پوری نہ ہوئی۔ اس آرزو کو تکمیل سے ہم کنار ہونا نصیب نہ ہوا اور وہ ہمیشہ مرنے کی آرزو میں مرتے رہے۔ ساری زندگی انھیں ماتمِ یک شہرِ آرزو ہی رہا۔ اور ایک آرزو کا ذکر ہے خوشی میں ہی ان کی سب آرزوئیں انھیں نہاں نظر آئیں۔ ان ہی گزشتہ آرزوؤں نے انھیں گورِ غریباں کا ایک چراغِ مردہ بنا دیا۔ وہ حسرت بن کر رہ گئے۔ اس غم کے ہاتھوں ان کی شخصیت نے ایک شمعِ کشتہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ وہ زندگی میں کئی بار مرے، بلکہ بار بار مرتے رہے لیکن انھیں موت نہ آئی۔ وہ مسرت جس کی ان کو آرزو تھی کا حصہ بن گیا۔ جس شخص کی زندگی میں حسرتیں ہی حسرتیں ہوں اور کچھ باقی نہ رہے۔ اور جس کی زندگی موت کی دوڑ دیکھتے ہوئے گزر جائے لیکن پھر بھی اُسے موت نہ آئے۔ اس کے غم کا بھلا کیا ٹھکانا ہے۔

پھر یہ غم بھی غالب کے یہاں ذاتی ہے وہ محض ذاتی اور انفرادی غم کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ اس کی تہہ میں تو زمانے کا غم کار فرما نظر آتا ہے۔ غالب اپنے ذاتی اور انفرادی غم کا سلسلہ اپنے زمانے کے غم سے ملاتے ہیں۔ زمانے کا غم ہی ان کے نزدیک اس انفرادی غم کا مرکب ہوا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ فرد کو معاشرے سے منفصل نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں فرد معاشرے سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ سماجی حالات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انہی اثرات سے اس کی شخصیت بنتی اور بگڑتی ہے۔ انہی اثرات کے ہاتھوں اس کا مزاج متعین ہوتا ہے۔ انہی کے توسط سے وہ ایک مخصوص شکل اختیار کرتی ہے۔ غالب اس حقیقت کا شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو، اپنے حالات کو، اپنے سماج کو اپنے آس پاس اور گرد و پیش کے واقعات سے الگ نہیں کیا ہے۔ ان کا خمیر انہی عناصر کی زندگی سے اٹھا تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو اسی زندگی کا ایک فرد سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زندگی کے حالات ان پر برابر اثر انداز ہوتے رہے ہیں۔ ان حالات کے نتیجے میں انھوں نے اپنی زندگی کو پریشان دیکھا ہے۔ انھیں حالات سے الجھتے اور لڑتے بھی رہے ہیں۔ زندہ رہنے اور زیست کرنے کے لئے انھیں خاصی جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ جو کچھ وہ کرنا نہیں چاہتے تھے وہ بھی انھیں طوعاً و کرہاً کرنا پڑا ہے۔ جس کام کو ان کا جی نہیں چاہتا تھا اس کو بھی وہ کرنے کے لئے مجبور ہوئے ہیں۔ انھوں نے جگہ جگہ کی خاک چھانی ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرے ہیں۔ لیکن اس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا ہے۔ جس چیز کی انھیں تمنا تھی وہ حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ جب زندگی کی سماجی بنیاد متزلزل ہو گئی ہو تو یہی ہوتا ہے۔ جب نظامِ اقتدار میں ہمواری نہ رہی ہو تو یہی حالات پیدا ہوتے ہیں۔ جب اصول اور عقیدے باقی نہ رہیں تو افراد کی زندگی میں یہی صورتِ حال رونما ہوتی ہے۔ جب کوئی نصب العین نہ رہے تو ہر شخص کو انھیں حالات سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ جب کوئی نظام نہ رہے تو ہر ایک کے سر سے ہو کر کچھ اسی طرح گزرتی ہے۔

غالب کو اپنے زمانے کی زندگی میں برپا ہونے والے حشر کا بخوبی علم تھا۔ وہ اس عرصۂ حشر کا سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ بلکہ سب کچھ تو ان پر بیت رہی تھی۔ اس سلسلے میں وہ محض خاموش تماشائی ہی نہیں تھے۔ وہ تو حالات کے سمندر میں پڑے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ان کو ساحل تک پہنچانے کے لئے تمام تر وہ جینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان حالات کو سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کا شعور ان کے قابو میں نہیں تھا۔ اس لئے وہ عملی طور پر اپنی ذات کی طرف زیادہ متوجہ نظر آتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو برقرار رکھنے کا خیال ان کے پیشِ نظر زیادہ رہتا ہے اور بادی النظر میں دیکھنے والے یہی محسوس کرتے ہیں کہ

بڑی ذات انھیں بہت عزیز تھی۔ اپنا مفاد بھی اُن کے نزدیک سب کچھ تھا۔ اس سے آگے سے باہر نکل کر وہ دیکھنے اور سوچنے ہی نہیں تھے۔ اور یہ بات ایسی کچھ غلط نہیں ہے لیکن اس کو تسلیم کر لینے کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب جو کچھ بھی ذات کے لئے کر رہے تھے اس میں درحقیقت اپنے طبقے کی روایت کو زندہ رکھنے کی کوشش بھی شامل تھی۔ اپنی خاندانی وجاہت کو برقرار رکھنے کا خیال بھی موجود تھا۔ اپنی معاشرت کی آن اور تہذیب کی شان کو نمایاں کرنے کی خواہش بھی کارفرما تھی۔ غالب اپنی ذاتی زبوں حالی پر کڑھتے ضرور تھے۔ اس پر خون کے آنسو ضرور بہاتے تھے۔ لیکن ان سب کی تہ میں یہ خیال ضرور ہوتا تھا کہ اس زبوں حالی کے ہاتھوں اُن کی خاندانی وجاہت اور نسلی برتری پر حرف آ رہا ہے۔ اُن کے طبقے کی رسوائی ہو رہی ہے۔ اُن کی معاشرت پر زوال کا سایہ منڈلا رہا ہے اور اُن کی تہذیب کا دم نکل رہا ہے۔ اس لئے غالب کی شخصیت اور اُن کے خطوں میں جگہ جگہ تشنگی نظر آتی ہے۔ بعض اوقات ان اندازوں کو سمجھنا ذرا مشکل ضرور ہوتا ہے لیکن غالب کے مزاج سے ذرا سی واقفیت اور ان کے فن کی روح سے تھوڑا سا لگاؤ بھی ان باتوں کو بہت واضح کر دیتا ہے۔ اور ان کو سمجھنے اور محسوس کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی بلکہ اگر ایسا کیا جائے تو یہ آوازیں ذہن و شعور پر چھا جاتی ہیں اور روح کے تہہ در تہہ گوشوں میں بھی اُن کا آہنگ اپنی جگہ بنا لیتا ہے۔

وہ ماحول جس میں غالب نے آنکھ کھولی سیاسی، تہذیبی اور سماجی اعتبار سے ایک ایسا ماحول تھا جس میں انتشار اور بدنظمی تھی۔ ایک سیاسی نظام دم توڑ رہا تھا۔ ایک معاشرت کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔ ایک تہذیب جسے جو برابر روشن کئے تھے وہ آج ہچکیوں کی زد پر تھے۔ مغلوں کے اقبال کا آفتاب گہنا چکا تھا۔ اب وہ صرف نام کے حکمران رہ گئے تھے۔ طاقت ختم ہو چکی تھی اور اس کی وجہ سے صدیوں کی بنی بنائی حکومت کا وجود خاک میں مل گیا تھا۔ حکومت کی کمزوری سے جو انتشار پیدا ہو سکتا ہے وہ اس ماحول میں عام تھا۔ لوگ زندگی سے بیزار تھے۔ انھیں اپنے مستقبل کا علم نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کی زندگیوں میں کوئی استواری نہیں تھی۔ وہ کچھ اُکھڑے اُکھڑے سے تھے۔ اس سیاسی انتشار نے سماجی زندگی کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ اس میں ایک خلا کی سی کیفیت تھی۔ البتہ تغیر کا عمل جاری تھا۔ نئے سماجی حالات پیدا ہو رہے تھے۔ نئی قدریں وجود میں آ رہی تھیں۔ لیکن ان حالات اور ان قدروں سے بہت سے لوگوں نے مطابقت پیدا نہیں کی تھی۔ اُن کے لئے یہ تغیر عجیب و غریب تھا۔ اس لئے وہ اپنی سماجی روایات کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتے تھے۔ انھیں ان روایات کے دم توڑنے اور ختم ہو جانے کا بڑا غم تھا۔ وہ اس پر آنسو بہاتے تھے اس کا رونا روتے تھے۔ سیاسی اور سماجی انتشار کا اثر تہذیبی معاملات پر یہ ہوا تھا کہ لوگ اس کو حسرت سے دیکھتے تھے۔ تہذیب کی جو عظیم روایت مغلوں نے قائم کی تھی اس کا ارتقا جیسے رک گیا تھا۔ اس کے آگے بڑھنے کی توقع بھی نہیں تھی کیونکہ ناسازگار حالات راہ کا روڑا بنے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے یہ تہذیب سب کو عزیز تھی۔ اس لئے اس کی ارتقائی کیفیت کے رک جانے کا سب کو غم تھا سب کے سب سوگوار تھے۔ سب کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ نئی زندگی کا آغاز یا طلوع ضرور ہو چکا تھا لیکن ابھی دھند اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ زندگی کو بدلنے اور اس میں نئے حالات پیدا کرنے کے خیالات بھی کسی نہ کسی صورت میں پیدا ہونے لگے تھے اور ان خیالات نے نیم مذہبی اور نیم سیاسی تحریکوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن ان تحریکوں کے سامنے بھی کوئی بہت واضح نصب العین نہیں تھا۔ اس لئے اُن کی کامیابی کی توقع کم تھی۔ معاشی اور اقتصادی زبوں حالی تو ان حالات میں پیدا ہونی ہی چاہئے۔ پرانے جاگیردارانہ نظام کی بنیادیں ہل چکی تھیں لیکن اس کی جگہ ابھی کوئی مستقل نظام نہیں سنبھال سکا تھا۔ نئی جاگیرداری کے پیدا ہونے کے آثار نظر آتے تھے۔ لیکن ابھی تک اس کا پیٹ تیار نہیں ہوا تھا اور کوئی خاص شکل نہیں بنی تھی۔ اس لئے ہر شخص مادی اور ذہنی دونوں اعتبار سے پریشانی اور زبوں حالی کا شکار تھا۔ کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ کیا ہونے والا ہے۔ زندگی کون سی کروٹ بدلنے والی ہے۔ اور حالات کون سا رخ اختیار کرنے والے ہیں۔ ان حالات نے احساسِ شکست کو عام کیا۔ شکست خوردگی افراد کی طبیعتوں میں داخل ہو گئی۔ رنج و الم ان پر چھا گئے۔ چنانچہ یہ حالت اُس وقت ہر شخص کی روز مرہ زندگی میں داخل ہو گئی تھی۔ زندگی مر کے جیئے جانے کا نام ہو گئی تھی۔ اور لوگ غالب کی طرح مرنے کی آرزو میں مرتے تھے۔ ظاہر ہے ان حالات میں جذباتیت کو تو ختم ہونا ہی چاہئے تھا۔ چنانچہ پوری جذباتیت زندگی میں کم ہو گئی تھی اور زندگی کے حقائق کا شعور بڑھنے لگا تھا۔ حقائق کی تلاش و جستجو کی طرف توجہ عام ہونے لگی تھی۔ لوگ سوچنے اور غور کرنے لگے تھے۔ حالات نے انھیں زیادہ حساس بنا دیا تھا اور وہ ایسی باتوں کے بارے میں بھی اظہار کرنے لگے تھے جن پر اب تک کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی۔

غالب اسی ماحول کی پیداوار ہیں اور اُن کی شخصیت اسی کی آئینہ داری کرتی ہے۔ اور اُن کا فن بھی اسی کا ترجمان ہے۔ اُن کے خیالات و نظریات بھی اسی ماحول

کی عکاسی کرتے ہیں۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب صرف اپنی انفرادیت ہی میں گم نہیں تھے۔ اُن کی آنکھیں صرف اندر ہی کی طرف نہیں کھلی تھیں۔ وہ اپنی ذات سے باہر نکل کر بھی دیکھتے تھے۔ اس زمانے کی اجتماعی زندگی کا سارا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اُس کے سارے نشیب و فراز اُن کی نظر میں تھے۔ ان حالات نے انھیں متاثر کیا اور اس حد تک متاثر کیا کہ وہ اپنی غزلوں میں ان حالات کی ترجمانی کرنے کے مجبور ہوئے۔ کہیں براہ راست اور کہیں بالواسطہ۔ لیکن ان حالات کی ترجمانی انھوں نے کی ضرور ہے۔ وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر میں اور ناز و غمزہ کی بات دشنہ و خنجر میں کرتے تھے۔ اسی لئے ان کی غزلوں میں ان حالات کے جو مختلف آثار اور اس ماحول کے جو مختلف پہلو ہیں ان کا پتہ لگانا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن جس کے پاس غزل کا صحیح مذاق اور اس کے مزاج کا صحیح شعور ہے۔ جو اس فن کے آداب کو جانتا اور سمجھتا ہے۔ اس کو غالب کی غزلوں کے ایسے اشعار میں بھی معانی کی دنیائیں نظر آ سکتی ہیں جو خالص تغزل سے تعلق رکھتے ہیں۔ غزل کا شاعر حسن و عشق کے پردے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ جاتا ہے۔ نہ جانے کتنے تاثرات ہوتے ہیں جن سے غزل کا ایک شعر پیدا ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنا وسیع پس منظر ہوتا ہے جس میں کسی ایک خیال کی تصویر بنتی ہے۔ نہ جانے کتنے محرکات ہوتے ہیں جن سے کسی ایک موضوع کا وجود ہوتا ہے۔ غالب کے یہاں بظاہر جو حسن و عشق اور اُس کے متعلقات کی باتیں ہیں وہ اُن کے ماحول اور معاصر حالات کے کسی نہ کسی اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اُن کے خاص داخلی اور انفرادی میلانات میں بھی ایک سماجی اور اجتماعی خیالات کی گونج سنائی دیتی ہے۔ غالب کی غزلوں کے اشعار کو ان کے اجتماعی پس منظر سے الگ کر کے دیکھنا اُن کے ساتھ زیادتی ہے۔

بات یہ ہے کہ غالب جذباتی معاملات تک کی ترجمانی میں اس اجتماعی شعور کا اظہار کرتے ہیں۔ زندگی کے خاص انفرادی اور جذباتی معاملات کو بھی غالب نے ایک سماجی اور اجتماعی زاویۂ نظر سے دیکھا ہے۔ وہ ان دونوں کو الگ کر کے دیکھنے کے قائل نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے حسن و عشق اور اس کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی ہے لیکن ان سب کو صرف جذبات کے حدود ہی میں نہیں رہنے دیا ہے بلکہ ہمیشہ ان کی یہ باتیں جذباتی حدود کو توڑ کر باہر نکل جاتی ہیں۔ اور وہ ان باتوں کو پیش کرتے ہوئے زندگی کی نہایت ہی بنیادی اور اہم حقیقتوں کی تصویر پیش کرنے لگتے ہیں۔ حسن اُن کے یہاں ایک کیفیت ہے، ایک منظر ہے۔ انسان کا حسن سے دلچسپی لینا فطری بات ہے۔ اس میں بڑا لطف ہے، بڑی کیف ہے لیکن

حسن سے دلچسپی لینے کے بھی کچھ آداب ہیں۔ ان آداب کے بغیر صحیح حسن پرستی ممکن نہیں۔ بوالہوس اگر حسن پرستی شعار کرے تو آبروئے شیوۂ اہلِ نظر جاتی رہتی ہے:

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

گویا غالب کے خیال میں حسن پرستی کے کچھ معیار ہیں۔ اور یہ معیار حالات کے پابند ہیں۔ سماجی زندگی میں بوالہوس کی کوئی حیثیت نہیں۔ کیونکہ وہ کسی اخلاقی معیار کا پابند نہیں ہوتا۔ اس کے پیشِ نظر بلند قدریں نہیں ہوتیں۔ اعلیٰ معیار نہیں ہوتے۔ اور اس سے اُس کے ہاتھوں بنیادی سماجی اقدار کی نفی ہوتی ہے۔ غالب کے یہاں حسن پرستی عشق کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ عشق زندگی میں ایک نظام رکھتا ہے۔ وہ زندگی کا ایک بہت ہی اہم پہلو ہے۔ اس کو سماجی اور اجتماعی زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سماجی زندگی کو متاثر کرتا ہے اور سماجی زندگی خود اس سے متاثر ہوتی ہے۔ اُن کا آپس میں ایک ربط ہے۔ اس لئے ان دونوں کو الگ کر کے نہیں دیکھنا چاہئے۔ غالب کے یہ اشعار اس حقیقت کو پوری طرح واضح کرتے ہیں:

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا
تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے — غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
[illegible] کا تحمل کر نہیں سکتی — مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے عہدِ نازک کی
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب — دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

یہاں غالب نے جس عشق کا بیان کیا ہے وہ صرف ایک جذباتی اور رومانی کیفیت ہی نہیں۔ بلکہ وہ سماجی زندگی سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے غمِ عشق اور غمِ روزگار ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ محبت کرنے والا رہینِ ستم ہائے روزگار رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود محبوب کے خیال سے غافل نہیں رہتا۔ اور بعض اوقات زمانہ اُس پر ایسے ستم ڈھاتا ہے کہ محبوب کی وفا سے بھی جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ عشق کے ساتھ غمِ روزگار کا یہ تصور اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ غالب عشق کو سماجی زندگی سے الگ کر کے نہیں دیکھتے تھے۔ ان دونوں کا خیال اُن کے یہاں ساتھ ساتھ پیدا ہوتا تھا۔ وہ ان دونوں کو خانوں میں نہیں بانٹتے تھے۔ اُن کے یہاں تو عشق زندگی ہے اور زندگی عشق۔ غالب کے زمانے میں عشق کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کے لئے جگر کے پیچھے کی ضرورت تھی۔ سماجی حالات کی ناہمواری نے اس وقت

افراد کو غمِ عشق سے زیادہ غمِ روزگار کا شکار کر رہا تھا۔ غالب نے اپنی غزلوں میں اسی صورتِ حال کی ترجمانی کی ہے۔ اور اس ترجمانی میں اُن کے سماجی شعور کو بڑا دخل ہے۔

اور یہ سماجی شعور غالب کے یہاں اس قدر بڑھا ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں اس زمانے کی زندگی کا اچھا خاصا مرقع کھینچتے ہیں۔ اسلوب غزل کا ہے زبان تغزل کی ہے۔ مضامین بظاہر عشقیہ ہیں۔ لیکن ایسے اشعار کی تہہ میں بھی اس زمانے کے سماجی حالات اور اس کی زبوں حالی کے مختلف پہلوؤں کی جھلک صاف نظر آتی ہے اور اس زبوں حالی نے جو اثرات چھوڑے ہیں اُس کا نقشہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ بظاہر تو غالب کے ان اشعار میں غمِ جاناں اور غمِ عشق کی باتیں ہیں لیکن درحقیقت ان میں غمِ عشق اور غمِ روزگار کا تذکرہ ہے۔ ان پر پردے ضرور پڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ان پردوں کو ذرا اٹھا کر دیکھا جاتا ہے تو اُن کے پیچھے اُس زمانے کی زندگی کی عام سماجی حالت، اُس کے بنیادی معاملات، اُس کے اساسی مسائل اور افراد پر ان سب کے رد عمل کے مختلف پہلو بے نقاب نظر آتے ہیں۔ اور اس بات کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کی سماجی اور اجتماعی زندگی کا کیا حال تھا، افراد پر کیا بیت رہی تھی۔ اور وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہے تھے؟

غالب کو اپنی تہذیبی عظمت کا احساس تھا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اُن کی تہذیب نے جو روایت قائم کی ہے۔ اُس پر یقیناً فخر کیا جا سکتا ہے۔ اُس نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، اُن کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اُس سے مطمئن نہیں ہوتے۔ اُن کا جی چاہتا ہے کہ اُن کی تہذیبی روایت میں اس سے بھی زیادہ وسعت ہوتی اور وہ اس سے کہیں زیادہ ترقی کرتی۔ یہ خیال غالب کے یہاں اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس تہذیبی روایت کو آگے بڑھتے ہوئے نہیں دیکھتے۔ جب انھیں اس کا ٹھہراؤ سا نظر آتا ہے۔ جب انھیں اس میں تھکن کے آثار دکھائی دیتے ہیں تو انھیں اس خیال کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ یہ شعر کہنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بظاہر تو یہ شعر ایک انفرادی جذبے کا ترجمان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تہہ میں درحقیقت ایک سماجی اور اجتماعی شعور کی کارفرمائی ہے۔ غالب نے اس سماجی اور تہذیبی حقیقت کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ اور وہ اس کا اظہار کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں۔ درحقیقت اس خیال کی ترجمانی اُنھوں نے اس ماحول ہی نے کرائی ہے۔ جس میں سماجی انتشار تہذیبی ارتقا کی راہ میں حائل ہو گیا تھا۔ اور اس کے آگے بڑھنے کی کوئی صورت نظر ہی نہیں آتی تھی۔

اسی غزل میں ایک اور شعر ہے جس میں اسی بنیادی خیال کو غالب نے کچھ اور بھی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ غالب کو مغلوں کی تہذیبی بساط کے اُٹھ جانے کا بڑا غم تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں وہ اس کو ایک بہت بڑا سانحہ سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ صورتِ حال پوری قوم کے لئے افسوسناک تھی ظاہر ہے مغلوں کی طاقت کا ختم ہونا ہندوستان کی تاریخ کا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ اُس نے تو اقدار کی قندیلیں بجھا دی تھیں۔ سماجی زندگی کے دھارے کے رُخ کو موڑ دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ہنگامے ہوئے۔ انتشار پیدا ہوا۔ اس انتشار اور ہنگامے کے اثرات افراد پر ہوئے۔ اُن کے ناموس پر آنچ آئی۔ ان کی عزت اور وقعت جو سب سے بڑی دولت تھی، خاک میں مل گئی۔ ان حالات میں افراد اپنے آپ کو بے آبرو محسوس کرنے لگے۔ غالب نے جب یہ شعر کہا تو اس کی تہہ میں درحقیقت یہی خیال تھا ۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہاں آدم کے خلد سے نکلنے کی تلمیح کا سہارا لے کر دراصل کیا کیا کچھ کہہ دیا گیا ہے خلد سے آدم کا نکلنا انسانیت کے لئے ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ غالب اپنے تہذیبی انحطاط کو اس سانحے سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس سے اس زندگی پر آنچ آئی جو اپنے تہذیبی کارناموں کے باعث انسانیت کے لئے ایک بہت بڑی دولت تھی۔ اُس معاشرت میں انتشار پیدا ہوا جو اپنی اعلیٰ اقدار کے باعث دنیا بھر میں مشہور تھی۔

اور اس صورتِ حال کے اثرات بڑھتے ہی گئے۔ دور رس ہوئے کہ اب زندگی کا مقصد رہا نہ معیار باقی رہے۔ قدریں منتشر ہو گئیں۔ اصول ڈانواں ڈول ہو گئے۔ ہر شخص کو ان حالات کا شکار ہونا پڑا۔ اس ہنگامے اور انتشار میں کسی کو بھی طمانیت نصیب نہ ہوئی۔ نفسی نفسی کا عالم پیدا ہوا۔ ایک دوسرے سے توقعات اٹھ گئیں۔ خستگی کی کوئی داد دینے والا نہ رہا۔ کیونکہ خستگی تو زندگی کا عام انداز ہو گئی۔ غالب نے اس شعر میں اسی بنیادی خیال کی ترجمانی کی ہے ۔

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

صاف ظاہر ہے کہ سماجی زندگی کے انحطاط و زوال کے باعث پیدا ہونے والی زبوں حالی اس شعر کی بنیاد ہے۔ اس شعر میں تو انفرادی اور داخلی آہنگ کا شائبہ بھی نہیں۔ یہ

ہیں تو اجتماعی زندگی کے عام انتشار کا نقشہ ایک عالمِ خستگی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس نقشے میں وہ صورتِ حال بہت واضح ہے۔ جس کا غالب کو بڑا غم تھا اور جس پر وہ ساری زندگی خون کے آنسو بہاتے رہے۔

غالب کی ایک اور غزل ہے جس کے بیشتر اشعار میں سوزِ نہاں سے دل کے بے محابا جلنے، اس میں ذوقِ وصل اور یادِ یار تک کے باقی نہ رہنے، گھر کو آگ لگنے اور اس کے نتیجے میں سب کچھ جل جانے، اپنے عدم سے پرے ہونے اور اس کی وجہ سے آہِ آتشیں تک کے بے اثر ہو جانے کا تذکرہ ہے۔ اس میں غالب نے افسردگی کی آرزو بھی کی ہے۔ کیوں کہ طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا نے انھیں ایسا کرنے کے لئے مجبور کیا ہے۔ اس کی تفصیل خود غالب ہی کی زبانی سنئے ۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

ان اشعار میں شخصی اور انفرادی باتیں ضرور ہیں۔ لیکن ان باتوں کو صرف انفرادی جذباتی زندگی کے معاملات تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ ان اشعار کا مجموعی تاثر زندگی کے کسی اور ہی تاثر کی تصویر دکھاتا ہے۔ غالب یہاں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اُن کے معاشرے میں ہر شخص کا دل سوزِ نہاں سے بے محابا جل رہا ہے۔ ساری سماجی زندگی میں بس ایک گھٹن والی کیفیت ہے۔ پوری تہذیب میں ایک آگ سی اندر ہی اندر پھیل رہی ہے۔ اور اس زندگی، معاشرت اور تہذیب پر ایک اداسی اور سوگواری کا عالم ہے۔ دلوں کی بستیاں ویران ہیں۔ ان میں اُمنگ نہیں۔ ولولہ نہیں۔ حوصلہ نہیں۔ ان سب پر اوس سی پڑ گئی ہے۔ اب پیچھے مڑ کر دیکھنے کا خیال ہے نہ آگے بڑھنے کی تمنا۔ بس ایک حسرت اور مایوسی کا عالم ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس آگ نے گھر کی ایک ایک چیز کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ اسی لئے معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں کوئی گرمی اور گرم بازاری نظر نہیں آتی۔ کسی قسم کی کشمکش جو ہوتی ہو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ کیونکہ زندگی کو حالات نے کچھ ایسا بنا دیا ہے کہ وہ عدم سے بھی پرے معلوم ہوتی ہے۔ اس پر مُردنی چھائی ہوئی ہے۔ اور اس کو دیکھ کر اس بات کا احساس ہوتا ہے جیسے وہ موت سے بھی کچھ آگے ہے۔ اس عالم میں بے دلی تو عام ہونی ہی چاہئے۔ جہاں یہ بے دلی ساری زندگی پر چھائی ہوئی ہے اور اس بے دلی کا یہ اثر ہے کہ ہر شخص افسردگی کی آرزو کر رہا ہے۔ کیونکہ زندگی سے جو توقعات وہ رکھتا ہے اُن کے پورے ہونے کا ان حالات میں کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غالب یہاں اسی صورتِ حال پر ماتم کر رہے ہیں۔

جب زندگی اس منزل پر آ جائے تو ظاہر ہے اُس میں کوئی دلکشی باقی نہیں رہ سکتی۔ ان حالات میں تو انسان کو خود اپنے آپ سے بیگانہ ہو جانا چاہئے۔ ایسے ہی عالم میں بے دماغی کا وجود ہوتا ہے جو موجِ بوئے گل کی ہوس سے محروم کر دیتی ہے۔ اس کا اثر اس طرح ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ ہر چیز سے طبیعت بیزار ہو جاتی ہے۔ موجِ بوئے گل تک سے دم ناک میں آنے لگتا ہے۔ سیرِ گل کو جی نہیں چاہتا۔ کیونکہ گلوں کے خندہ ہائے بے جا برداشت نہیں ہوتے ۔

بہت تھی مجھ سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

یہ اشعار شکست خوردگی اور احساسِ شکست کی کیفیت کو پوری طرح ظاہر کرتے ہیں جب اجتماعی زندگی میں مایوسیوں کا بسیرا ہو تو افراد پژمردگی، یاس اور مردنی سے بے زار ہو جاتے ہیں۔ کوئی چیز بھی انھیں اچھی نہیں لگتی۔ کسی چیز سے بھی اُن کا دل نہیں بہلتا۔ انھیں زندگی میں کسی قسم کی کوئی دلکشی نظر نہیں آتی۔ وہ دنیا سے منہ موڑ لیتے ہیں اور اُن کی زندگی ایک مستقل کرب کے عالم میں بسر ہوتی ہے۔ غالب نے یہاں اسی صورتِ حال کی عکاسی کی ہے۔ اُن کے زمانے میں زندگی کا کچھ یہی حال ہو گیا تھا۔ کوئی منزل سامنے نہیں تھی۔ کوئی نصب العین پیشِ نظر نہیں تھا۔ اسی لئے لوگ زندگی سے دُور ہو جاتے تھے۔ انھیں اس کی مسرتوں اور رعنائیوں سے جیسے کوئی تعلق ہی نہیں رہ گیا تھا۔ اور یہ بات ایسی کچھ عجیب نہیں تھی۔ جب اجتماعی زندگی کے اُفق پر انحطاط و زوال کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہوں تو افراد کو ایسی صورتِ حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اُن کی ذہنی کیفیت کچھ اسی طرح کی ہو جاتی ہے۔

اس سماجی انحطاط اور تہذیبی زوال کے باعث پیدا ہونے والی تباہی اور بربادی کا بیان غالب نے اپنی غزلوں میں جگہ جگہ کیا ہے۔ اُن کے یہاں ان خیالات کی ایک بڑی رو سی ملتی ہے۔ مختلف پہلوؤں سے اس کا بیان اُن کے یہاں ہوتا ہے۔ مختلف زاویوں سے وہ اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اور اس طرح اس انحطاط و زوال کی پوری تصویر اُن کے کلام میں سے اُبھرتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ

اس کے یہاں نہیں ہے۔ کیونکہ اس سلسلے میں غالب کا انداز نظر تمام تر خارجی نہیں تھا۔ البتہ جو کچھ وہ تلاش کرتے ہیں اس سے اس زمانے کے افراد کی اس ذہنی کیفیت کا سراغ آنکھوں میں ہو جاتا ہے جو انحطاط و زوال نے پیدا کی تھی۔ اس موضوع پر آشفتہ کیفیت بھی بعض شعروں سے نکلتے ہیں ۔

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی — در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے — میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال، نہ نظارۂ جمال — مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط — دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ — یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں — نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے — ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ — ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

گر ہوئی رفتار غالب تو اب اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

یہ سب کچھ انحطاط و زوال ہی کا اثر ہے کہ غالب کی نظریں کاشانے کی خرابی دیکھتی ہیں اور در و دیوار سے انھیں جنگل بیاباں کی کیفیت ٹپکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ دور دور تک ویرانی کا سیلاب دکھائی دیتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہر طرف ہُو کا عالم ہے۔ جو لفظ محض وحشت ہی وحشت ہے۔ تہذیب اور تمدن کے علم برداروں کا حال ایسا ہے جیسے کوئی شمع کو بجھا دے۔ محفلیں سونی پڑی ہیں۔ زندگی کی محفل سے بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل ہر ایک پریشان ہی نکلا ہے۔ ساری زندگی ایک ظلمت کدہ بن گئی ہے۔ اس ظلمت کدے میں شبِ غم کا بڑا جوش ہے۔ دلیلِ سحر ایک شمع ہو سکتی تھی سو وہ بھی خاموش پڑی ہے۔ ایسے میں مژدۂ وصال اور نظارۂ جمال کا خیال بے معنی بات ہے۔ لیکن اس عالم میں بیتی ہوئی بہار کا خیال تو آ ہی جاتا ہے۔ غالب کو خیال آتا ہے اور وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ہر گوشۂ بساط دامانِ باغبان و کفِ گل فروش تھا۔ لطفِ خرامِ ساقی جنتِ نگاہ اور ذوقِ صدائے چنگ فردوسِ گوش بنے ہوئے تھے۔ لیکن زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ سرور و سوز اور جوش و خروش باقی نہ رہا۔ داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی، سو اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی ——— اس کے ساتھ ہی غالب کو اپنی معاشرت اور تہذیب کی محرومی کا خیال بھی آتا ہے اور وہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ جو اس تہذیب کے علم بردار ہیں وہ پیغام کے تشنہ لب ہیں۔ ان کے پاس کامیابی اور کامرانی کا کوئی پیغام نہیں آتا اور ان کے سامنے غیر بھری محفل میں جام کے بوسے لے رہے ہیں۔ لیکن وہ اس صورتِ حال کا شکوہ نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک یہ تو سب چرخِ نیلی فام کے ہتھکنڈے ہیں ۔ غالب کو اس صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہے کیونکہ انھیں اس کی وجہ سے ہر شخص گریہ و زاری کرتا ہوا نظر آتا ہے ——— اور یہ آثار کچھ اچھے نہیں کیونکہ گریہ و زاری اچھا شگون نہیں۔ اس سے تو بستیاں ویران ہو جاتی ہیں۔ یہ شعر غالب کے صاف ہے ان اشعار میں بھی بنیادی طور پر ذاتی اور انفرادی آہنگ موجود ہے لیکن چونکہ وہ سب کے سب اُس ذہنی کیفیت کے ترجمان ہیں جو اس وقت ہر شخص پر طاری تھی۔ اس لئے یہاں اس انفرادیت میں بھی ایک اجتماعی آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ اور ساری شعریت کی جھلک نظر آتی ہے۔ بہر حال یہ اشعار پوری طرح اُس زمانے کی اجتماعی زندگی کے ترجمان معلوم ہوتے ہیں۔ اس زمانے کی عام حالت کا ان سے پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ غالب نے محسوس کیا ہے کہ یہ سماجی حالات اور اجتماعی زندگی کی کیفیت افراد کے لئے خاص پریشان کن رہی ہے۔ وہ اس پر کڑھتے ضرور ہیں لیکن انھیں کچھ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے انھیں نہ جانے کس کس بات کی حسرت رہتی ہے۔ وہ ایسے شب و روز اور ماہ و سال کا خیال کرتے رہتے ہیں جو اب موجود نہیں۔ کاروبارِ شوق کو انھوں نے ختم ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ ذوقِ نظارۂ جمال انھیں خاک میں ملتا ہوا نظر آیا ہے، اور وہ اس پر لہو روتے ہیں۔ لیکن دل کھول کر لہو رونے کی بھی انھیں فرصت نہیں ملی ہے۔ فکرِ دنیا میں انھیں سر کھپانا پڑا ہے۔ حالانکہ اس کے بارے میں انھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا ——— وہ تو اس کو ہمیشہ جان کا وبال ہی سمجھا کرتے تھے۔ غالب نے کس خوبی سے اس صورتِ حال کی ترجمانی کی ہے۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

ایسا آساں نہیں لہو رونا — دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں — میں کہاں اور یہ وبال کہاں

درحقیقت غالب کے یہاں اُس الجھنے کی ترجمانی کی ہے جس میں اس انحطاط و زوال اور انفرادی و انتشار کا اثر سب سے زیادہ تھا جس کے افراد اپنے آپ کو ایک عظیم تہذیب اور تہذیبی روایت کا علم بردار سمجھتے تھے۔ جب وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے تو انھیں اپنی ایک عظیم تہذیبی روایت کی تاریخ دور دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ اور وہ اس تہذیبی روایت میں کاروبارِ شوق کے ہنگامے دیکھتے تھے۔ نظارۂ جمال انھیں اس کی بنیادی خصوصیت نظر آتی تھی۔ یہ تو گویا اس کی گھٹی میں پڑی تھی جس کے درمیان زندگی بسر کرنا اور حسن کی تخلیق کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ لیکن اب ان افراد کی نظریں یہ دیکھتی تھیں کہ یہ سارا کاروبار ختم ہو چکا ہے۔ اب ذہن ہے نہ حسن کی تخلیق۔ اب تو بس فکرِ دنیا میں سر کھپانا رہ گیا ہے۔ غالب کے ان اشعار میں انھیں خیالات کی گونج اور انھیں احساسات کا آہنگ سنائی دیتا ہے۔

یہ حالات، ظاہر ہے کہ طاقت ختم ہو جانے کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ لوگوں نے طاقت کو ختم ہوتے ہوئے دیکھا لیکن وہ کچھ کر نہ سکے کیونکہ ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ خود طاقت نہیں رکھتے تھے۔ اس موقع سے نئی طاقتوں نے فائدہ اٹھایا اور وہ حکمراں ہو گئیں۔ ان کے ہتھکنڈوں کو اس زمانے کے لوگ سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے بڑے بڑے سبز باغ دکھانے کچھ لوگوں پر اس کا اثر بھی ہوا اور وہ ان کے دام میں پھنس کر ان کی اُلفت کا دم بھرنے لگے لیکن اس کے باوجود انھیں اپنے پا بہ زنجیر ہونے کا احساس بہر حال تھا کہ جیسے غالب نے اپنے اس شعر میں اسی صورتِ حال کی ترجمانی کی ہو ۔

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد — ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

اس زمانے کے ہندوستان، خصوصاً دلّی کے سیاسی حالات کو سامنے رکھا جائے تو اس شعر میں بڑی معنوی وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سیاستِ افرنگ نے اپنا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا اور اس سر زمین پر دام بچھا دئے گئے تھے لیکن بہت سے بھولے لوگوں نے انھیں دام سمجھا نہیں تھا۔ ان میں پرواز کی طاقت موجود تھی لیکن وہ اڑ نہیں سکتے تھے۔ اُلفتِ صیاد ان کا راستہ روکتی تھی۔ اس زمانے کی تاریخ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

غالب نے یہاں طاقتِ پرواز کا ذکر کیا ہے۔ جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی کی صلاحیتوں سے بے خبر نہیں تھے۔ ان کے خیال میں تو اس وقت بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا لیکن حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کشاکشِ غمِ پنہاں سے فرصت ہی کہاں تھی کہ کوئی اقدام کیا جاتا ۔

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا — فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

یہاں مجنوں کی تلمیح کو پیش کر کے غالب نے اسی صورتِ حال کی وضاحت کی ہے۔ اس وقت عمل کا ماحول نہیں تھا لیکن دلوں میں اس عمل کی خواہش ضرور تھی۔ حوصلہ اور ولولہ ضرور تھا۔ لوگ تعمیر چاہتے تھے لیکن تعمیر آرزو اور تمنا ہی تک محدود تھی۔ غالب نے اس کیفیت کی ترجمانی بڑی خوبی سے کی ہے

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے — عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

اس شعر میں منظر، بلندی، عرش اور مکان سب علامتی حیثیت رکھتے ہیں اور اس زمانے کی عملی زندگی کا جو حال تھا، لوگ جو کچھ سوچ رہے تھے، جس چیز کی انھیں تمنا اور آرزو تھی، اس کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں۔

یہ خیال غالب کے یہاں پیدا نہ ہوتا اگر ان کو اس اپنے زمانے کی اجتماعی زندگی کے حالات کا شعور نہ ہوتا ——— وہ ان حالات کا پورا شعور رکھتے تھے۔ انھوں نے ان حالات کو پوری طرح سمجھا تھا اسی لئے انھوں نے آرزو کے چراغوں کو جلائے رکھا۔ عمل کی راہ پر گامزن ہونے اور نئی زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کا ایک پیغام بھی دیا ہے۔ وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیوں میں کھو جانے کے قائل نہیں۔ یہ سرمستیاں اُن کے خیال میں اب واپس بھی نہیں آ سکتیں۔ اسی لئے لذتِ خوابِ سحر سے اُٹھنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں ۔

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

اس شعر میں حالات کے بدلنے، پرانی زندگی کے ختم ہونے اور ایک نئی زندگی کے پیدا ہونے کی طرف واضح اشارے موجود ہیں۔ غالب نے یہاں اس صورتِ حال کو سمجھنے، اس سے مطابقت پیدا کرنے اور عمل کی راہ پر آگے بڑھنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب کے پاس ایک واضح پیغام موجود تھا۔

یہ افکار و خیالات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ غالب صرف اپنی ہی شکست کی آواز نہیں تھے۔ ایک معاشرت، ایک تہذیب، ایک نظام کی آوازِ شکست بھی اُن کی آواز میں شامل تھی اور یہ آوازیں آپس میں کچھ اس طرح ملی جلی تھیں کہ بعض اوقات ان کو پہچاننا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن غالب کی شخصیت اور ماحول سے دلچسپی رکھنے والے کو ان کی اس مخصوص آواز اور لَے میں ایک اور لَے بھی دکھائی دیتی ہے۔

مختارالدین احمد

'فغانِ بے خبر' میں غالب کا ذکر

خواجہ غلام غوث بے خبر (۱۸۲۴ء-۱۹۰۵ء) کے بزرگ کشمیر کے رہنے والے
تھے لیکن ان کے دادا خواجہ حضور اللہ بہ سلسلۂ تجارت نیپال سے اور دہلی میں بس گئے۔ غلام غوث
کی ولادت دہلی میں ہوئی لیکن تعلیم و تربیت بنارس میں ہوئی جہاں وہ بعد کو لفٹنٹ گورنر
بہادر ممالکِ مغربی و شمالی کے میر منشی مقرر ہوئے۔ بے خبر شاعری ان کے ذوقِ سخن کی ...
اردو ذوق بہت پاکیزہ رکھتے تھے۔ فارسی شاعری کے متعلق ان کے دوست
اور معاصر مرزا غالب لکھتے ہیں: "ایمان سے اس کو کہتے ہیں جدتِ طرز اس کا نام ہے
جو ڈھنگ تازہ والا جاہ یا ان کے خیال میں گزرا تھا وہ تم بروئے کار لائے۔" اردو
نثر کا اندازہ ان اردو رقعات سے بخوبی ہو سکتا ہے جو انھوں نے سپردِ قلم کیے ہیں
اور جن کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

غلام غوث بے خبر اور مرزا غالب کے تعلقات کب سے شروع ہوئے اس کا
حال نہیں معلوم، لیکن یہ ضرور ہے کہ ۱۸۵۸ء سے پہلے ہی ایک دوسرے سے متعارف ہو
چکے تھے، یہی زمانہ ان کی باہمی خط و کتابت کے آغاز کا بھی سمجھنا چاہیے۔ تعلقات
اور خط و کتابت کا سلسلہ غالب کی زندگی کے آخری دنوں تک قائم رہا۔

بے خبر کی ساری تصانیف کو سامنے رکھا جائے تو تقریباً ہر ایک کتاب میں
کچھ نہ کچھ مواد غالب کی زندگی اور شاعری کے متعلق مل سکے گا۔ مثال کے طور پر انشائے بے خبر
میں غالب کے ایک شعر سے متعلق بے خبر کی تفصیلی رائے ملتی ہے جس میں انھیں غالب
کے مصرعِ ثانی کے لفظ سے متعلق اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی | رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات | عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

خواجہ صاحب اس پر مفصل گفتگو کرتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

"عجیب خلطِ مبحث ہے۔ پہلے شعر کا تو یہ مطلب ہے کہ سلوک میں
جب جیسی واردات ہو ویسا برتاؤ برتے، کیفیتِ سکر میں ہو
تو بیکرانہ بے خودی میں سر پائے خم پر رکھ دے اور حالتِ صحو
میں ہو تو مناجات کرنے کو رو سوئے قبلہ ہو بیٹھے۔ یہ متعلق
بہ سالک ہے۔ دوسرے شعر کے یہ معنی ہیں کہ تغیرِ صفات میں
بھی ناظرِ جلوۂ ذات رہے۔ تشبیہ ہو تقلب اور حجابِ شاہدِ تنزیہ
ہے اسے نظارۂ ذات سے مانع نہ ہو۔ ہر صورت میں وہی
حسن ہر ذرہ میں وہی جھلک دیکھے ..... پہلے شعر کو دوسرے
سے اور دوسرے کو پہلے سے کوئی تعلق نہیں اور تقریر کے
مساعد ہونے سے مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ مرزا نے دوسرے
شعر کے پہلے مصرعہ کی بندش سے اور بھی معنی کو ژولیدہ کر دیا ہے
اسے جو یوں کہا ہے: یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
یوں کہنا تھا:

پیمانۂ صفات کو گردش اگرچہ ہو

دونوں شعروں کو باہم ربط تو اس سے بھی نہ ہوتا، مگر دوسرے
شعر کے معنی صاف ہو جاتے۔ متقدمانِ اردو علاوہ کلام اس قابل
نہیں ہوتے کہ کوئی اس کی شرح میں فکر کرے۔ غور و خوض کے
لائق محققین کا کلام ہوتا ہے۔ یہ کچھ ضرور نہیں کہ جو شاعر ہو
وہ صوفی بھی ہو۔"

خواجہ صاحب کی تصانیف میں جو ہم تک پہنچی ہیں: فغانِ بے خبر

فغانِ بے خبر، ... اور انشائے بے خبر ہیں۔ پیشِ نظر مضمون میں خواجہ کی
اور تصانیف سے قطعِ نظر کرکے صرف 'فغانِ بے خبر' میں غالب سے متعلق جو معلومات
ملتے ہیں، انھیں پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

'فغانِ بے خبر' ان کے اردو رقعات، 'تقریظوں'، دیباچوں، خطبوں اور
مختلف تحریروں کا مجموعہ ہے جو مولوی امیر الدین کے اہتمام سے الہ آباد سے ۱۸۹۱ء/
۱۹۰۰ء میں شائع ہوا۔ اب اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔

(۱) 'فغانِ بے خبر' میں غالب کے متعدد فارسی اور اردو شعر ملتے ہیں۔ بعض شعر
تو بے خبر نے اپنے خطوط میں نگینے کی طرح جڑے ہیں۔ ان میں کوئی شعر غیر مطبوعہ
نہیں اس لیے انھیں نقل نہیں کیا جاتا۔ یہاں اس امر کا ذکر صرف اس لیے کر دیا
گیا کہ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کے شعر ان کے زمانے ہی میں
کس قدر مقبول اور مروج ہو گئے تھے کہ ان کے اہم معاصرین اساتذۂ قدیم کے
اشعار کی طرح انھیں اپنے خطوط میں درج کیا کرتے تھے۔

(۲) اس کتاب میں غالب کے مندرجہ ذیل احباب اور تلامذہ کے نام خطوط
ملتے ہیں:

عبدالرزاق شاکر (۲ خط)، نواب ضیاء الدین خاں رخشاں و نیر (۲ خط)،
نواب مردان علی خاں رعنا (۲ خط)، ممتاز علی خاں میرٹھ (۲ خط)۔ بے خبر کے ان
خطوں میں سے جو مندرجہ بالا احباب کے نام ہیں بعض اقتباسات پیش کیے
جاتے ہیں:

مکتوب بے خبر بنام عبدالرزاق شاکر

"میرے عہدے کا تعین میں آنا، میرا خدا نخواستہ ڈپٹی کلکٹر
ہونا دونوں محض غلط ہیں۔ میرے اختیار میں ہوتا تو میں آپ کو
نائب تحصیل دار کیا تحصیل دار بلکہ ڈپٹی کلکٹر کر دیتا۔ مگر کیا کروں
نوکری کی اس زمانے میں جیسی قلت اور اس کے حاصل کرنے
میں جیسی دقت ہے آپ بھی جانتے ہیں۔" ص ۱۰۱

بنام ضیاء الدین خاں رخشاں

[خواجہ صاحب نے پہلے خط میں رخشاں سے ان کی تصویر مانگی ہے۔ دوسرے
خط میں تصویر بھیجنے کا شکریہ ادا کیا ہے جو درج ذیل ہے:]

"تسلیم شکریہ عرض کرتا ہوں کہ تصویر پہنچی، لفافہ کھولتے
ہی جو چہرۂ انور پر نظر پڑی بے اختیار پوچھ بیٹھا، مزاج مبارک،
اور وہ رنگِ فراق کی شکایت، اشتیاق کی حکایت عرض کرتا رہا۔
جب کچھ جواب نہ سنا تو پرسش کیا اور دیکھا کہ آپ نہیں ہیں تصویر
ہے۔ اب اس کی زیارت کے لئے ایک دن بھی احباب قرار دوں گا۔"

ص ۲۵۸

بنام مردان علی خاں رعنا:

"حکومت اور امارت اور دولت مبارک ہو۔ کیا میں اس مژدہ
سنانے کے لائق نہ تھا جو اوروں کو لکھا گیا اور مجھے نہیں۔ احبابِ قدیم
بھی تقویمِ پارینہ کے شمار میں آ گئے۔ خیر اب یہ فرمائیے کہ یہ جو مشہور
ہے کہ بہتے دریا میں ہاتھ دھو، اس باب میں آپ کا کیا مشرب
ہے۔ یعنی کیا آپ اپنی سرکار میں بھی ڈیڑھ ڈبو کسی طرح کی نوکری
پر نوکر بھی رکھ سکتے ہیں یا نفسی نفسی پر عمل ہے۔" ص ۱۳۳

بنام ممتاز علی خاں، میرٹھ

"حضرت سلامت، آپ کے پہلے خط میں کچھ آپ کا پتا
اور نشان نہیں لکھا تھا۔ اس حیرت میں تھا کہ جواب کہاں
بھیجوں۔ کل آپ کا دوسرا خط آیا۔ گو مسکن کا پتہ اس میں بھی نہیں
مگر اس سے اتنا معلوم ہوا کہ آپ آوارۂ میرٹھ بنانے کے کاروبار
بن گئے ہیں۔ ... میری عیادت کو آنے سے آپ کے جس شعر کو
خاستہ کیوں ہو، جنت ہوتی تو یہ آپ کب وہاں رہنے دیتی۔
بے اختیار یاد آتے۔ جو لکھا ہے کہ گردن جھکا کر صفحۂ قلب پر
تصویر دیکھ لیتا ہوں، خدا ترقی عطا کرے۔ بعد اس کے وہ
حال طاری ہو کہ گردن جھکانے کی تکلیف بھی جاتی رہے۔" ص ۱۰۱

(۳) اب ذیل میں خواجہ صاحب کے ان خطوں سے بعض ضروری اقتباسات
پیش کیے جاتے ہیں جن کے مکتوب الیہ غالب کے سوا اور لوگ ہیں۔ لیکن ان
خطوں میں غالب کی زندگی یا تصانیف سے متعلق کوئی نہ کوئی بات کہی گئی ہے۔
منشی ممتاز علی میرٹھ کے رہنے والے تھے اور مطبع مجتبائی کے مالک تھے۔ غالب
کی "عودِ ہندی" کا پہلا ایڈیشن انھیں نے شائع کیا تھا۔ چودھری عبدالغفور سرور

نے غالب کے رقعات جمع کئے اور ایک دیباچہ لکھا۔ بے خبر نے مزید خطوط حاصل
کئے۔ کچھ غالب سے لئے اور کچھ کالپی، لکھنؤ، بریلی، آگرہ وغیرہ سے فراہم کئے۔
اصل خطوں کا نقل سے مقابلہ بھی کیا۔ پھر انھیں مرتب کرکے ایک جلد بنا کر منشی
ممتاز علی کے پاس طباعت کے لئے بھیج دیئے۔

بے خبر نے منشی ممتاز علی کو جو خطوط اس سلسلے میں لکھے ہیں، ان کے دو
اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ ابھی عود ہندی شائع نہیں ہوئی ہے، مسودہ
کی ترتیب ہو گئی ہے۔ بے خبر مجموعے کو منشی ممتاز علی کے پاس بھیجتے ہیں تو
یہ خط لکھتے ہیں:

"مرزا نوشہ صاحب کی نثر کا مجموعہ مرتب کرکے آج
منصف صاحب کے حوالہ کیا کہ قاضی الدین حسین خاں کے
پاس بھیج دیں اور وہ آپ کی خدمت میں روانہ کریں۔ مصنف
آپ کے بہت قریب ہیں ایک نظر ان کو بھی دکھا دیجئے تب
چھپوانا شروع کیجئے تو بہتر ہے۔ فقیر نے اس کی ترتیب دینے اور
لکھوانے اور بنانے خود مقابلہ کرنے میں محنت نہیں کی بلکہ اتنا
تردد اور کیا کہ جو رقعات بریلی سے آگئے ہوئے آپ نے لکھوا بھیجے
ان کو وہاں سے طلب کروایا اور سوائے اس کے کچھ اور لکھنؤ،
اس پورے کچھ ہم پہنچایا اور تین خود بھی مصنف سے اور بھی
اور سب کو بھی مجموعے میں داخل کیا اور جہاں کچھ شک تھا
مصنف سے اس کی تصحیح کرلی۔ اب اگر یہ مجموعہ طاق نسیاں
پر رکھا رہے اور جلد چھپے تو مستحق بڑا احسان ہوگا۔ فقیر کے
پاس تو اصل موجود ہے جب دیکھے گا کہ آپ نہیں چھپواتے
تو اپنے کاتب سے ایک نسخہ اور لکھوا لے گا اور جو جو مشتاق
کلام غالب ہوں گے ان کو دے دے گا۔"

ص ۵۹

عود ہندی کی طبع میں تاخیر ہوتی ہے، اور جب ۱۸۶۸ء میں شائع ہو جاتی ہے۔ غالب
اس کو دیکھ کر سخت ناپسند کرتے ہیں۔ ان کے احباب اسے کچھ دنوں کے ساتھ
دوبارہ اردوئے معلیٰ کے نام سے شائع کر دیتے ہیں۔ منشی صاحب کو اس کی اطلاع
ملتی ہے تو پریشان ہوتے ہیں اور صورت حال جاننے کے لئے خواجہ صاحب کو
لکھتے ہیں۔ خواجہ صاحب فرماتے ہیں:

"عود ہندی یعنی مرزا غالب کے رقعات کا مجموعہ یہاں تک پہنچا
افسوس ہے کہ نہایت غلط چھپا۔ بہت جگہ غلطی سے مطلب
خبط ہے۔ چھپنے والے نے بیچ کیا۔ میرٹھ میں یہ مجموعہ ترتیب
اور نام بدل کر چھپا ہے۔ امیر فخرالدین مہتمم اکمل المطابع نے
چھاپا ہے۔ اردوئے معلیٰ نام رکھا ہے۔ دو حصے قرار دئے
ہیں۔ ایک حصہ جس میں رقعات ہیں ختم ہوئی لیا اور ہوگیا
دو دو روپیہ کو بکتا ہے۔ دوسرا حصہ جس میں متفرقات نثری
ہوں گی ابھی نہیں چھپا ہے۔ اردوئے معلیٰ اور عود ہندی میں
یہ فرق ہے کہ اکثر رقعے اس کے اس میں ہیں اور اس کے
اس میں نہیں ہیں۔ دوسرا حصہ چھپ جانے کے بعد جو شخص
ان تینوں کتابوں کو بمعہ رقعات فقیر جمع کرے گا وہ مجموعہ کامل
ہوگا۔"

ص ۱۴۱ - ص ۱۴۲

عبدالرزاق شاکر غالب کے تلامذہ میں تھے اور ان کے نام غالب کے متعدد
خطوط اور اصلاحیں موجود ہیں۔ غلام غوث بے خبر غالب کی حیات کے آخری
زمانے میں دہلی جاتے ہیں اور ان سے ملتے ہیں۔ اپنے تاثرات وہ عبدالرزاق
شاکر کو اس طرح لکھتے ہیں:

"آپ کا خط اخیر اکتوبر میں آیا اور میں نومبر کے شروع
میں دورے کو جانے والا تھا خیال تھا کہ دہلی پہنچوں حضرت
غالب سے ملوں تو پھر خط کا جواب، ملاقات کی کیفیت
سب ایک ہی دفعہ لکھوں۔ اس کی حقیقت یوں ہے کہ میں
نومبر کو یہاں سے روانہ ہوا [illegible] لشکر سے جا ملا۔ جب
وہاں سے کوچ ہوا تو حکم ہوا کہ اب دہلی نہ جاویں گے میرٹھ
پہنچ کر جو مقام کوٹ سے ہوئے اور [illegible] دہلی نہ جانا۔ دو
روز کی رخصت لے کر دہلی گیا۔ احباب سے ملا، شہر کا دیکھنا
مزارات کی زیارت کرنی۔ دو دن میں کیا کیا کرتا۔ بہرحال ایک
ایک بار حضرت غالب سے دو بار ملا اور انھیں دیکھ
کر بہت رنج ہوا فی الواقع اب وہ پیر فانی ہو گئے ہیں لوچی
غلطی یہ ہے کہ سامعہ بالکل باطل ہے، گفتگو کریا ہی ہوتی ہیں۔
عرصۂ دراز کے بعد ملاقات ہو، جی چاہے کہ بہت سی باتیں

لیجئے۔ لکھتے ہیں بھلا کہاں تک لکھئے گرجوش دعا اس ذکر کا بہت
درست، شوخی طبیعت اور ظرافت کا وہی عالم نجات مولوی
صدرالدین خاں صاحب کے کہ ان کے حواس میں بھی فتور آگیا ہے"

۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو غالب کا انتقال ہو جاتا ہے۔ غالب کے تلامذہ اور
احباب قطعات تاریخ اور مرثیے لکھتے ہیں۔ مجروح کا قطعہ اور حالی کا مرثیہ کس نے نہیں
پڑھا۔ عبدالرزاق شاکر بھی استاد کی وفات پر ایک قطعہ لکھتے ہیں اور خواجہ غلام غوث
کو بھیجتے ہیں۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

"ہائے کیا لکھئے! مولانا غالب کا مرنا، اب تک یہ کلمہ زباں پر
لانے کو جی نہیں چاہتا۔ آپ سچ فرماتے ہیں کہ جیتے افسردگی
کیا رہی۔ ان کے مرنے کا غم جیتے جی نہ جائے گا۔ تاریخ آپ
نے کیا خوب کہی ہے۔ غزل بھی بہت اچھی فرمائی ہے۔ میں بہت
محظوظ ہوا۔ اس سخن فہم کو کہاں سے لاؤں کہ آپ کی شیریں سخنی
کی داد دے۔ مگر آپ کے دورے میں دہلی جانا ہوگا اگر یہ پڑھوں گا
تاکہ زیارت اور کی کوشش ہو۔"

(۴) مرزا غالب نے جو خطوط خواجہ غلام غوث بے خبر کو لکھے ہیں وہ عود ہندی
اور اردوئے معلیٰ میں موجود ہیں۔ ذیل میں غالب کے قدردانوں کی خدمت میں
بے خبر کے کچھ خط پیش کئے جاتے ہیں جو انھوں نے مرزا غالب کی خدمت میں بھیجے
تھے اور جن کی نقلیں انھوں نے اپنے مجموعۂ خطوط کے لئے رکھ چھوڑی تھیں۔ یہ
خطوط بے خبر کی زندگی ہی میں ان کے مجموعۂ نثر فغان بے خبر میں چھپ گئے تھے لیکن
اس مجموعے کی کم یابی کے باعث سو سال کے بعد اب یہ خطوط دوبارہ شائع
کئے جا رہے ہیں۔

ان سارے رقعات کے مکتوب الیہ مرزا غالب ہیں۔ ان کے مطالعے سے
مرزا اور ان کی بعض تصانیف کے متعلق کچھ نئی روشنی ملتی ہے۔ یقین ہے انھیں
خاص دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ اب ذیل میں وہ خطوط پیش کئے جاتے ہیں:

مرزا اسداللہ خاں عرف مرزا نوشہ صاحب غالب تخلص کے خط کا جواب

(۱)

حضرت

آج علی الصباح میں گورکھپور کے میدان میں فقیر کے خیمہ میں
بیٹھا تھا۔ چکیں جو چاروں طرف کے دروازوں کی کھنچی تھیں، صاف
قفس کی صورت تھی۔ ہر سمت کو دیکھتا تھا اور تنہائی سے گھبرا گھبرا
کر یہ مصرع پڑھتا تھا

ہائے تنہائی اور کنج قفس

دفعتاً جو دیکھا تو غل ہوا، حیرت میں آیا کہ کس کی سواری آتی ہے۔
دیکھا تو دیکھا کہ شوق اور تمنا اور محبت ان ساروں سے حشم و خدم کو
آگے آگے اہتمام ہے اور پیچھے ان کے حضرت ذہن ترتیب گونہ گونہ
پہناتے چلے آتے ہیں۔ پھر تاب کسے تھی بے اختیار دوڑا۔ پیچھے
سے باہر آیا، جھک کر آداب بجا لایا۔ رکاب تھام کر گھوڑے سے
اتارا۔ قدم لے، پیچھے پیچھے گیا۔ مسند پر بٹھایا۔ صدقے میں
اپنے کو اتارا۔ دو زانو ادب سے سامنے بیٹھا۔ ہاتھ باندھ کر
مزاج مقدس پوچھا۔ جواب میں علالت کی کیفیت، ضعف کی
شکایت سنی۔ رو رو گیا۔ نصیب دشمناں کہہ کر دعا کی کہ پروردگار
ہمیشہ صحیح و سالم رکھے حضرت کی عمر اتنی بڑھائے کہ خضر کو رشک
آئے۔ ادھر ادھر کا ذکر آیا۔ ارشاد ہوا کہ جیسے واقعی پہنچ کر
تمھیں ایک خط لکھا تھا عرض کیا کہ اس کے ورود سے مشرف
ہوا تھا۔ جواب لکھنے میں رامپور والے وظیفے کے رسید کی راہ
دیکھتا تھا۔ اس میں اس سوال کا ذکر آیا جو اس وظیفے میں
ایک مشتری کی نسبت کیا تھا۔ حضرت نے فرمایا اس کو دیکھ رہا
تھا کہ ناظم کا کشش آگیا اور [illegible] ہوا۔ یہ سن کر میں نے شعر
بنا کر کہا اور اس وقت میں [illegible] خوب جامست کر
کہ اس نے بیراجہ رکھ لیا۔ حضرت نے تبسم کرکے فرمایا اس
بے چارے پر کیوں خفا ہوتے ہو۔ میں اب جاتا ہوں اور تم
وظیفہ کو دیکھ کر سوال کا جواب لکھتا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت تشریف
لے گئے۔ جب تک سواری نظر آئی میں دور سے پھر کر حسرت
کی نگاہوں سے دیکھا کیا۔ پھر گورکھپور میں آ کر بیٹھا اور یہ اشعار
کسی کے جو برمحل یاد آگئے تھے انھیں پڑھ رہا ہوں۔

این نیست کہ از راہ وفا آمدہ رفتی

ستم زدہ غلط ورنہ چہ پیدا آمدہ رفتی

چمن داں زد نشستی کہ شود غنچہ دل وا
پھول ہوئے گل و باد صبا آمدہ رفتی
بہ جوانی سرِ ہر گل بسر آمد بہ دو روز
خود بہ سرا ہی بے سر و پا آمدہ رفتی

الیضاً

(۳)

جناب عالی

پرسوں عنایت نامہ پہنچا۔ کل اخبار کا لفافہ آیا۔ میں ان دو نعمتوں کا ہزاروں شکر بجا لایا۔ الحمد للہ کہ آپ نے کسی زمانے میں کلکتہ تشریف لے جاتے ہوئے ملاحظہ فرمایا ہوگا اس وقت یہ شہر خدا جانے کیسا ہوگا ع

ہماری جہد میں اس پہ تو ویرانی برستی ہے

عجب طرح کا شہر جو اجڑے ہوئے گاؤں سے بدتر ہے، کسی فن کا کامل، کسی امر کا شوقین دہلی جیسا کوئی نظر نہیں آتا۔ ملا بشیر الدولہ صاحب اور دو چند مسلمان ہیں انھیں کسی مذاق کا اشتغال نہیں پایا۔ کتاب کون خریدے۔ اخبار کون منگاتے ہیں۔ سرا ہیں مجھے اور کتابوں سے شوق نہیں۔ بوستان خیال فارسی کی البتہ خریدار اور اخبار تو سرکاری آتے ہیں کہ مجھے انھیں کے دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ منشی ممتاز علی خاں صاحب کو میں نے لکھا تھا کہ آپ ایک عرضی جناب کسی صاحب بہادر افسر مدارس کے حضور میں بھیج دیں اور اس میں لکھیں کہ حضرت غالب نے اپنے کچھ خطوط کا ذکر لکھا ہے اُسے میں مرتب کرتا ہوں عنقریب چھپنا شروع ہوگا۔ کچھ جلدیں مدرسوں کے لئے آپ بھی خرید لیں تو آپ کی اس اعانت سے کتاب جلد چھپ جائے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ صاحب تک پہنچانے کا میری رائے میں نہ آیا۔

جا بجا سے جو آپ کے خطوط جمع کیے گئے وہ اصل تو نہیں سے آئے نہیں نقلیں آئی ہیں۔ سرور کے نام کے ایک خط ہیں

جہاں اسیر کا ایک مصرعہ لکھا ہے وہ اسی قدر پڑھا جاتا ہے،

'زنجیرہ و شکر آب است'

بعد اس کے کیا جانئے کیا لفظ لکھا ہے۔

مارہرہ والوں کے خط کا حال تو آپ پر خوب ہو گیا ہے اور یہ شعر لفظ 'بخشش' کو کہیں مذکر لکھا ہے اور کہیں مؤنث۔ آپ تو اسے مؤنث کیوں بناتے تحریر خرابی بھی کاتب سے ہوئی ہے۔ ان دونوں کی تصحیح کیجیے تو کتاب میں صحیح لکھ دیا جائے۔

[غلام غوث بے خبر]

(۳)

حضرت

نسخہ عود ہندی کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش سے مرتب ہوا ہے۔ چودھری عبدالغفور صاحب کے پاس سے آپ کے خطوط اور ان کا دیباچہ آ گیا۔ میں نے سوائے اس کے کہ آپ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ کاپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبرآباد سے آپ کی تحریریں فراہم کیں۔ خود سب کو دیکھا۔ جو مضامین ذاتی اعلان کے دیکھے ان کو نکال ڈالا۔ کاتب لکھ رہا ہے میں مقابلہ کرتا ہوں۔ اب تک بیس صفحوں کے دس جزو مرتب ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ امید ہے ادھر اگست کا آغاز ہو ادھر اس مجموعے کا انجام ہو۔ میں اپنے حق سے ادا ہوں، چھپوانے کے لئے ان کے حوالے کروں۔ اس وقت بھی مقابلے میں مصروف ہوں۔ پڑھتے پڑھتے آپ کو لکھنے کا خیال آیا کہ نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ، منشی حبیب اللہ ذکا، میاں داد خاں صاحب سیاح اور حضرات کے پاس بھی آپ کے رقعات ضرور ہوں گے۔ آپ انھیں ایما کریں کہ جس کے پاس جو کچھ ہو بہ سبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیں۔ رام پور میں تو میں نے خود لکھا ہے شاید وہاں سے بھی کچھ آ جائے جب تک کتاب تمام ہو اور جس قدر خطوط ہاتھ آویں اور اس میں شامل ہوں غنیمت ہے۔

مرزا اسد اللہ خاں صاحب غالب کے نام

(۴)

جناب عالی

میں نے ایک عریضہ اس سے پہلے آپ کو بھیجا ہے اور اس میں مطلب جواب طلب لکھا ہے کہ مولوی صاحب جہانگیر نگری نے جو رسالہ تصنیف کیا ہے اس کا نام کیا ہے اور وہ کہاں چھپا ہے۔ آج تک جواب نہ آیا۔ کیوں کہ مجھے حیرت نہ ہو۔ جب رکھ جواب حضرت کی عادت نہ ہو۔ جواب عنایت کیجئے مجھے بڑے انتظار سے نجات دیجئے۔

الحمد للہ کہ عود ہندی کی ترتیب تمام ہوئی۔ جلد بند ہو کر آج ہی منشی ممتاز علی خاں صاحب کی خدمت میں روانہ کر دی۔ اب چھپوانے میں دیر کریں یا جلدی، انھیں اختیار ہے۔

(ایضاً)

(۵)

دی شام ہجر کے دن کو   شب غم کو عطا سحر ہوئی

میں تیسری نومبر کو الہ آباد سے یہاں آیا۔ امید قوی تھی کہ اس جلسے میں کہ اکبرآباد تمام ہندوستان کے رئیسوں کا جمع ہے جیسے بھی بہ تقریب دربار یہاں تشریف لائیں گے۔ ایک عمر اشتیاق اور تمنا میں کاٹی ہے۔ چند روز لطف صحبت اٹھائیں گے۔ ہر روز خبر لیتا کہ دہلی سے کون آیا۔ کل جو حافظ زین الدین صاحب آئے مژدہ امید کے بدلے خبر یاس لائے۔ ان سے معلوم ہوا کہ حضور کا ارادہ نہیں۔ کیا عرض کروں کیسی حسرت و افسردگی ہوئی۔ اللہ اللہ ایک عالم لکھا ہوتا ہو مصیبت دکھائی فراق کا ہم نہیں ہوتے سے ہم مصیبت کشوں کی دید کو   گو زمانے کا انقلاب رہا

(ایضاً)

(۶)

جناب عالی

پہلا عریضہ میرا پہلی جلد سمیت جو بھیجی گئی ہے ملاحظہ سے گزرا ہوگا۔ یہ دوسرا عریضہ دوسری جلد کے پہنچنے کی اطلاع دیتا ہوں۔ دوسری جلد تقسیم نامہ پہنچی۔ شکر عنایت بجا لایا۔

حضرت یہ صحیح نامہ کیسا ہے مجھے تو اس میں غلطی کا شبہ ہوا جاتا ہے۔ صفحہ ۲ اٹھارویں سطر چودھویں کے غلاف غلطیں وہ اور غلاف صحیح میں 'دق' لکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ دق ہے 'دق' صحیح دیا ہے۔

صفحہ اول سطر دوسری میں غلط 'امیر' صحیح 'اسیر' تحریر ہے۔ میری دانست میں غلط صحیح اور صحیح غلط ہے۔

صفحہ اونتالیس سطر گیارھویں میں غلط 'داؤ فرضا' اور صحیح 'داو ضا' مسطور ہے۔ میری سمجھ میں دونوں لفظ نہیں آتے۔ غالب ہے کہ جو کتاب میں ہے وہی صحیح ہو یا کاتب کی غلطی سے میری توجہ مدد کی بھی ضعیف ہو گئی ہے کہ سمجھ نہیں سکتا یا صحیح نامہ غلط نامہ ہے۔ آپ ملاحظہ فرما کر میری تسکین فرما دیں۔

(۷)

جناب

ایسی کیا آپ کی اور اپنی تحریریں ہیں جو مجھے ملتفت کیا ہے کچھ نہیں کہا تھا۔ طرفین کے ضعف نے عجب کیفیت دکھائی ہے کہ نہ میرے مطلب کو آپ سمجھتے ہیں نہ آپ کے مدعا کو میں۔

میں آٹھویں صفحے کی چودھویں سطر کا حال لکھتا ہوں۔ آپ اس صفحے کی سترھویں سطر کو بتاتے ہیں اور 'نالوش' کا تو میں ذکر ہی نہیں کرتا۔ آپ اسے کیوں اغلاط میں سمجھتے فرماتے ہیں۔ اسیر اور امیر کی نسبت اسی صفحے اور دوسری سطر کے اس شعر میں گفتگو کرتا ہوں۔

امروز میر چند بود انجمن طراز
آں روز گشت شاہ نجف بر سر امیر

میں اپنا عریضہ واپس بھیجتا ہوں۔ اس کو اور صحیح نامہ اور کتاب کو انھیں صفحوں اور سطروں کے نشان سے ملا کر ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ میں کیا عرض کرتا ہوں۔

اس کو اصل بحث سے ہٹ کر پڑھا جائے تو یہ مفہوم سمجھ میں آتا ہے کہ غالب نے غزل کی تنگ دامانی محسوس کر لی تھی اور اس سے نکلنا چاہتے تھے۔ یہی سمجھ کر اور یہ سوچ کر کہ غزل کا ہر شعر یہی جگہ الگ ہوتا ہے بعض ذمہ دار لوگوں نے غزل کے خلاف غالب کی تائید سے کر بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس شعر کے کہنے کے وقت دہ غالب کو غزل کا سانچہ اظہار مطالب کے لئے ناکافی معلوم ہوا تھا۔ انھیں زندگی کے نئے تقاضوں کا احساس تھا جو انقلاب کے بعد ہنگامے سے پیدا ہو گئے تھے۔ یہ شعر گریز کا شعر ہے۔ جب شاعر غزل کہتے کہتے ممدوح کی تعریف کی طرف بڑھنا چاہتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ غزل کی حد سے نکل کر قصیدے کی سرحد میں قدم رکھ رہا ہے معذرت کرتا ہے۔ غزل کے دوسرے اشعار سے یہ شعر مربوط ہے:-

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل — کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے
دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے — بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے
زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

غالب نے مثنویاں اور قصیدے لکھے ہیں، رباعیاں بھی کہی ہیں، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے متاثر ہو کر اس دور میں مرثیے کے تین بند بھی لکھے تھے، جن کو دیکھ کر آگے لکھنے کا ارادہ نہیں کیا۔ اگر یہ روایت صحیح نہ بھی ہو تو مسدس، مخمس، مربع اور مثنوی وغیرہ میں شعر کہنے والا غالب جس صورت اور جس صنف میں چاہتے لکھ سکتے تھے۔ ان پر کسی نے غزل کہنے کی پابندی نہیں لگائی تھی۔

یہ بات تو یہیں ختم ہو گئی ہم کہہ یہ رہے تھے کہ غالب نے اردو غزل کو ایسا انداز بیان دیا جس میں غور و فکر کے عناصر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ انھوں نے دکھا دیا کہ غزل کی ترقی کا راستہ یہ نہیں ہے کہ محدود مضامین میں تخیل کی موشگافیوں اور مبالغے کی انتہا کا مظاہرہ کیا جائے بلکہ اس میں گہری معنویت، ندرت اور تنوع پیدا کرنا چاہئے۔ غالب کی ترکیبیں اور تشبیہیں بھی مثالیں پیدا کرتی ہیں۔ خود داری ساحل، فردوس گوش، خانہ ویرانی، نگہ دیدۂ تصویر، قفس رنگ، جوش آئینہ داری، چراغاں سر رہگذر باد، نقش رنگ، سادہ پرکار، شوق منفعل، سوز غم ہائے نہانی کی ایسی کتنی ہی ترکیبیں دیوان غالب میں بکھری ہوئی ہیں۔ غالب کی ذوقی تشبیہوں کی ایک ایک مثال اور ان کے پرستار عبدالرحمن بجنوری نے محاسن کلام غالب میں دی ہے ان میں چند یہ ہیں: بہار کو حسد پائے خزاں، جوہر آئینہ کو طوطی بسمل، دام موج کو حلقۂ صد کام نہنگ، تار اشک کو رشتۂ چشم سوزن، دریا کو زمین کا عرق انفعال کہنا انھیں کا حصہ ہے۔

۔۔ دسمبر ۱۹۵۶ء کو دہلی میں ایک یادگار ادبی محفل منعقد ہوئی جس میں وزیر داخلہ پنڈت گووند ولبھ پنت نے پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی کو ان کی ساٹھ سالہ ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایک ابھینندن گرنتھ (صحیفہ سپاس) پیش کیا۔

جوش صاحب نے ۱۸۹۰ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ ان کا پہلا شعر یہ ہے:

امیر وہ نہیں جس کا کہ دل فقیر نہیں — فقیر وہ نہیں جس کا کہ دل امیر نہیں

یہ کتاب ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، بخشی غلام محمد، دیگر اکابر ملک اور مشہور ادبا و شعراء کے پیغامات شامل ہیں۔ سفیر ایران ہز ایکسیلنسی علی اصغر حکمت نے جوش صاحب کی خدمت میں ایرانی دو تصنیفات پیش کیں۔ تصویر میں پنڈت پنت جوش صاحب کو ابھینندن گرنتھ پیش کر رہے ہیں۔

غالب کے شاگرد

مرزا ہرگوپال تفتہ سکندرآبادی

نواب محمد یوسف علی خاں ناظم رامپوری

نواب ضیاء الدین احمد خان صاحب بہادر نیر رخشاں دہلی

در زمانہ ہماری شہر دہلی میں حال جناب
ضیاء الدین احمد خان خلف الصدق فرز
نواب احمد بخش خان بہادر مرحوم کی ذ
بابرکات سے بڑی رونق ہے اوصاف حم
بیرون از تحریر اور اخلاق پسندیدہ خا
رنظیر ہیں فن شاعری میں لاثانی
فصاحت و بلاغت میں ثانی خاقانی ہیں
فکر کی شمع ملایک آسمان پیمائی اور رتبہ
مسند عالی مستجاب کہ ناموس رسا علم تواریخ
مسکہ کمال ہے مورخان جہان کو ان کی
ذات بابرکات سے فیض حاصل ہے —

نواب سعید الدین احمد خان صاحب بہادر دہلی

حامے جناب نواب
یاء الدین احمد خان صاحب
کے بڑے صاحبزادہ والاشان
شرافت شمع شبستان مروت
بزم ثروت نواب سعید الدین احمد
ن صاحب بہادر ہیں —
یر عنوان صفحہ پر درج ہے فصاحت
یں طاق فن مروت میں شہرہ آفاق

میر مہدی حسین مجروح دہلوی

منشی شیو نرائن آرام اکبرآبادی

مالک رام

نواب علی بہادر خاں (باندہ)

ہندستان کی تاریخ میں پیشوا باجی راؤ اوّل کی جو اہمیت ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مغلیہ سلطنت کے زوال پر مرہٹوں کا عروج بہت حد تک اسی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ وہ جب اپریل ۱۷۲۰ء میں اپنے والد بالاجی کی وفات پر شاہو اوّل (مرہٹہ راجا) کا پیشوا بنا ہے، تو اس کی عمر مشکل سے ۱۹ برس کی ہوگی۔ نوجوانی میں جوانی کا خون اور طبیعت میں جاہ پسندی کا ولولہ، اس نے اپنی جارحانہ فوجی پیش قدمیوں سے ہر طرف ہلچل ڈال دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے برسوں ہی میں مرہٹہ سلطنت وسطِ ہند کی حدود سے نکل کر شمالی ہندستان کے بڑے حصے پر قابض ہوگئی۔

۱۷۲۹ء میں اس نے بندیل کھنڈ پر حملہ کیا۔ وجہ یہ تھی کہ نواب محمد خاں بنگش نے راجا چھتر سال بندیلہ راجپوت کو جیت پور میں گھیر لیا۔ راجا نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لیکن مخلصی کی کوئی صورت نظر نہ آئی، آخر اس نے پیشوا کو مدد کے لیے لکھا۔ باجی راؤ نے اس کی درخواست منظور کی اور فوج لے کر منزلیں مارتا ہوا آن پہنچا۔ محمد خاں نے دیکھا کہ مقابلہ سخت ہے، تو اس نے شاہِ دہلی سے کمک کی درخواست کی۔ بادشاہ سلامت نے محمد خاں کے بیٹے قائم خاں ہی کو فوج دے کر روانہ کیا۔ باجی راؤ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا، اس نے قائم خاں کو راستے ہی میں روک لیا تاکہ باپ بیٹے کا ملاپ نہ ہو سکے، لیکن اس اثنا میں چھتر سال بنگشوں کے [illegible] سامنے نہ ٹھہر سکا اور اس نے راہِ فرار اختیار کی۔ اس طرح قلعہ جیت پور محمد خاں کے قبضے میں آگیا۔ باجی راؤ، قائم خاں سے فارغ ہو کر دوبارہ محمد خاں کے مقابلے میں آیا۔ محمد خاں جیت پور میں قلعہ بند ہو گیا تھا لیکن مرہٹوں نے محاصرہ کر کے رسد کا ناکہ بند کر دیا۔ آخر کار رسد ختم ہو جانے کے باعث محمد خاں نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی۔ شرط یہ ٹھہری کہ آئندہ محمد خاں کبھی بندیل کھنڈ کا رخ نہیں کرے گا، نہ چھتر سال سے کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کرے گا۔

بادشاہِ دہلی کو جب معلوم ہوا کہ محمد خاں نے یوں دب کے صلح کر لی ہے، تو وہ سخت ناراض ہوا اور اس نے اسے الٰہ آباد کی صوبہ داری سے الگ کر کے اس کی جگہ سربلند خاں کو مقرر کر دیا۔

راجا چھتر سال نے اپنی ممنونیت کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا۔ اس نے پیشوا کے اعزاز میں ایک شاندار دربار منعقد کیا اور اپنے علاقے میں بہت بڑی جاگیر اس کو دی۔ اس نے اپنے دونوں خورد سال بیٹوں (جگت راج اور ہردے ساہ) کا ہاتھ بھی باجی راؤ کے ہاتھ میں دے دیا اور اس سے وعدہ لیا کہ وہ ہمیشہ ان کی حفاظت کرے گا۔ اور ان سب پر مستزاد، اس نے اسی موقع پر باجی راؤ کو مستانی[1] بطور تحفہ پیش کی۔

مستانی کون تھی؟ اس سے متعلق مختلف روایتیں[2] ہیں لیکن اکثریت کی رائے یہ ہے کہ اس کا باپ ہندو اور ماں مسلمان تھی اور وہ خود بھی اسلام کی پیرو تھی۔ گانا اور ناچنا اس کا پیشہ تھا اور وہ اپنے فن کی ماہر تھی۔ سب مورخ اس پر متفق ہیں کہ یہ "فتنۂ روزگار و رستخیز عام" اپنے زمانے کی حسین ترین عورتوں میں سے تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ تاریخ محمد شاہی کے مطابق "وہ شہسوار

۱؎ "مستانی" سے متعلق ایک مستقل مضمون وسنت دینا ناتھ راؤ نے انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن کے دسمبر ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں پڑھا تھا۔ یہ اس سال کی جلد (نمبر ۱۷) میں شامل ہے۔ اسی سلسلے میں جی۔ ایس۔ سردیسائی کی کتاب New History of Marathas جلد دوم کا ص ۱۷۰ تا ۱۷۷ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

۲؎ جی۔ ایس۔ سردیسائی: جلد دوم، ص ۱۷۰

نواب علی بہادر باندہ

غالب نے آپ ہی سے متعلق یہ شعر کہا تھا ؎

غالب! خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

آپ سے متعلق مالک رام صاحب کا مضمون صفحہ ۳۳ سے صفحہ ۰۰ تک ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں آپ نے انگریزوں کے خلاف بڑی سرگرم معرکہ آرائیاں کیں۔ میر شکوہ آبادی آپ کے دربار سے متعلق تھے۔ مہاراجہ بنارس کے مہمان تھے کہ وہیں قولنج کا حملہ ہوا اور جاں بحق ہوگئے۔ بنارس ہی میں فاطمین میں مدفون ہوئے۔ تنویر نے تاریخِ وفات لکھی:-

نواب علی بہادر اے جسمِ کرم — یوسف طلعت شجاعِ یکتا ہے ہے
اے قدر شناس و ناز بردارِ ہنر — اے اہلِ سخن کے حق میں فراہ ہے ہے
اے صدر نشینِ خلق و اقبال و شکوہ — اے بزمِ کرم میں مسند آرا ہے ہے
اٹھ جائے جو تو زمانے سے — صد حیف افسوس واویلا ہے ہے

تاریخ تری یہ رو کے کہتا ہے تنویر
فیاضِ زماں امیرِ زیبا ہے ہے
۱۲۹۰ھ

اور برہمنوں اور خود اس کے خاندان میں بھی مخالف تھی۔ وہ باجی راؤ کی فوجی مہموں اور معرکوں میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی۔ ان صوری و معنوی خوبیوں کے باعث باجی راؤ دل و جان سے اس کا دلدادہ و فریفتہ ہوگیا اور اس کا زیادہ وقت اس کی صحبت میں گزرنے لگا۔

پیشوا کا خاندان قدامت پسند برہمنوں کا تھا۔ ایک مسلمان عورت سے اس کے تعلقات ہی بجائے خود کچھ کم قابلِ اعتراض نہیں تھے۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ اس نے مستانی کی صحبت میں گوشت کھانا اور شراب پینا بھی شروع کر دی۔ اس سے برہمنوں میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی اور پورا خاندان اس کے خلاف ہوگیا۔ لیکن اس کی سطوت اور جبروت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ سب دم بخود ہو کر خاموش بیٹھے تھے۔

۱۷۳۹ء میں باجی راؤ، نواب ناصر جنگ کے خلاف مہم پر باہر چلا گیا۔ مستانی اس کے ساتھ نہ گئی اور پونا ہی میں رہی۔ "زور بر عضو ضعیف" کے مصداق مخالفوں کو اپنا غصہ مستانی پر نکالنے کا موقع مل گیا۔ وہ پیشوا کی گمراہی اور اس کی خلافِ مذہب حرکات کے لئے مستانی کو ذمہ دار گردانتے تھے۔ باجی راؤ کے بیٹے نانا صاحب اور بھائی چیما جی آپا نے مستانی کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ یہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ یہ کانٹا ہمیشہ کے لئے نکل جائے۔ چنانچہ انھوں نے چھترپتی شاہو سے اجازت مانگی کہ مستانی کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن شاہو اس پر رضامند نہ ہوا اور اس طرح اس کی جان بچ گئی۔ لیکن وہ بدستور قید ہی میں رہی۔

پیشوا کو جب یہ خبریں مہم پر پہنچیں تو انھیں مستانی سے اس قدر عشق اور روحانی لگاؤ تھا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ سب کام چھوڑ کے فوراً اس کی مدد کو پہنچتا۔ لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ واپس جاتا تو مہم کی ناکامی یقینی تھی۔ پھر شاہو کی اجازت کے بغیر واپسی سرکشی کے مترادف ہوتی۔ خاندان کی مخالفت اس کے علاوہ۔ آخر اس کے خاندان نے اپنا ایک نمائندہ اس کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ اسے مستانی سے قطع تعلق کر لینے پر آمادہ کرے۔ بھلا وہ اس تجویز پر کس طرح رضامند ہو سکتا تھا۔ لیکن مستانی کی مسلسل نظربندی نے دنیا اس کی آنکھوں میں اندھیر کر دی اور اس سے اس کی زندگی کو گھن لگ گئی۔ شراب اور بد اعتدالیوں نے اس کی صحت کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ رہی سہی کسر اس روحانی تکلیف نے پوری کر دی۔ ۲۸ اپریل ۱۷۴۰ء میں اچانک اس کا انتقال ہوگیا۔

مستانی پونا میں قید تھی۔ جب اسے باجی راؤ کی وفات کی خبر ملی تو اس کی روح پرواز کر گئی۔ یہ آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ آیا اس کی موت صدمے سے ہوئی یا اس نے خودکشی کی تھی۔ بہرحال اس عجیب محبت کی معمولی سی قبر پونا سے ۲۰-۳۰ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں "پابل" نامی میں دیکھی جا سکتی ہے جو دنیا کی بے ثباتی اور حسن و محبت کی خونیں داستان کا عبرت ناک مرقع ہے۔

مستانی کے بطن سے باجی راؤ کے ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ چونکہ مستانی مذہباً مسلمان تھی، پیشوا نے اس لڑکے کا نام شمشیر بہادر رکھا اور اس کی پرورش بھی اسلامی طریقے پر ہوئی۔ بعد میں اس نے بندیل کھنڈ کی اپنی جاگیر میں سے باندہ بطور تحفہ اس لڑکے کے نام کر دیا جس سے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں اس کے محاصل تیس لاکھ سالانہ تھے۔

شمشیر بہادر کی صحیح تاریخ پیدائش معلوم نہیں۔ لیکن چونکہ پانی پت کی تیسری لڑائی (۱۷۶۱ء) کے وقت اس کی عمر ۲۷ برس کی بتائی گئی ہے اس لئے قیاس ہے کہ اس کی پیدائش ۱۷۳۴ء کے لگ بھگ ہوئی ہوگی۔ یہ لڑائی مرہٹوں اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان ہوئی اور اس میں مرہٹوں کو شکستِ فاش ہوئی تھی۔ اس موقع پر شمشیر بہادر مرہٹوں کی طرف سے شریکِ جنگ تھا اور اس کے ایسے کاری زخم آئے تھے کہ وہ ان سے جانبر نہ ہو سکا۔ اس نے اپنے پیچھے ایک لڑکا علی بہادر نام چھوڑا۔

۱؎ یہ سردیسائی کا بیان ہے۔ راؤ لکھتے ہیں کہ جب نمائندہ واپس پونا آیا تو اس نے باجی راؤ کے بیٹے نانا صاحب سے کہا کہ مستانی کے بغیر باجی راؤ کی زندگی محال ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اسے آزاد کر کے اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔ وہ "پابل" تک پہنچی تھی کہ اسے باجی راؤ کے انتقال کی خبر ملی، جس کے سنتے ہی وہ ختم ہو گئی۔

۲؎ یہاں ایک غلطی کی تصحیح کر دینا چاہیے۔

عام طور پر یہ مشہور ہے اور تقریباً سب مؤرخ وغیرہ یہی لکھتے ہیں کہ مستانی کے بطن سے باجی راؤ کے بیٹے کا نام علی بہادر تھا۔ یہ غلط ہے۔ تمام مرہٹی ماخذ جو اس بارے میں زیادہ قابلِ اعتماد ہیں، اس پر متفق ہیں (باقی اگلے صفحے پر)

شمشیر بہادر کی وفات کے بعد علی بہادر اس کا وارث اور باندہ کی جاگیر کا مالک ہوا۔ مہادجی سیندھیا کا نام اس لئے مشہور ہے کہ اس نے شاہ عالم ثانی کو غلام قادر خاں روہیلا کے پنجے سے نجات دلائی تھی۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ غلام قادر کی گرفتاری کا سہرا علی بہادر کے سر ہے۔ جب سیندھیا کی فوج شاہ عالم کی مدد کے لئے دہلی پہنچی تو غلام قادر نے لال قلعہ سے راہِ فرار اختیار کی۔ اس نے پہلے میرٹھ کے قلعے میں پناہ لی۔ علی بہادر نے اس کا تعاقب کیا۔ کچھ دنوں کے محاصرے کے بعد غلام قادر چند سپاہیوں کے ساتھ یہاں سے بھی کھسک گیا اور شاملی سے تین میل جنوب مغرب کی طرف ایک گاؤں بھنوٹی میں ایک برہمن کے گھر میں جا چھپا۔ برہمن نے مخبری کی اور علی بہادر کو اطلاع دے دی اور وہ گرفتار ہوگیا۔ علی بہادر نے اسے پابجولاں لاکے مہادجی سیندھیا کے پیش کر دیا۔ آخر شاہ عالم کے حکم سے سیندھیا نے اسے انتہائی [illegible] ۱۷۸۹ء کو قتل کروا دیا۔ کلوخ انداز را پاداش سنگ است۔

جلد ہی مہادجی سیندھیا اور علی بہادر کی آپس میں بگڑ گئی۔ آخر علی بہادر اپنا رفقا سمیت اس سے الگ ہوگیا۔ برسوں کی آوارہ گردی کے بعد اس نے باندہ کے گرد و نواح میں ایک مضبوط ریاست قائم کر لی۔ وہ کالنجر کے قلعے کا محاصرہ کئے پڑا تھا کہ ۲۲ اگست ۱۸۰۲ء کو معمولی علالت کے بعد اس کا اچانک انتقال ہوگیا۔ غلام قادر روہیلے کی گرفتاری کے سلسلے میں اس نے جو خدمات سرانجام دی تھیں ان کے صلے میں شاہ عالم نے اجازت دے دی تھی کہ اس کے خاندان کی میتیں قطب صاحب دہلی میں دفن ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ جب علی بہادر کالنجر میں فوت ہوا تو اس کی لاش دہلی میں لائی گئی اور قطب صاحب میں دفن ہوئی۔[۱]

علی بہادر کی وفات کے وقت اس کا بڑا بیٹا شمشیر بہادر پونا میں تھا۔ باندہ میں اس کا چھوٹا علاتی بھائی ذوالفقار بہادر اور اس کا ماموں غنی بہادر تھے۔ غنی بہادر نے ذوالفقار بہادر کو گدی پر بٹھا دیا۔ فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور کالنجر کا محاصرہ جاری رکھا۔ جب شمشیر بہادر کو پونا میں باپ کی وفات کی خبر ملی تو وہ منزلیں مارتا ہوا باندہ پہنچا۔ یہاں پہنچ کے اس نے ذوالفقار بہادر کو مسند سے اتار دیا اور غنی بہادر کو گرفتار کر کے اجے گڑھ کے قلعے میں نظر بند کر دیا، جہاں بعد میں زہر خورانی سے اس کی موت واقع ہوئی۔

باندہ کی ریاست انگریزوں نے ۱۸۰۴ء میں واپس لے لی اور اس کی جگہ شمشیر بہادر کا چار لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ خود اس کے اور اس کے خاندان کے گزارے کے لئے مقرر کر دیا۔ پھر اس کے چند سال بعد باندہ کے قریب خاص ایک علاقہ سکونت کے لئے دیا اور اسے اجازت دی کہ وہ باوردی محافظ دستہ [illegible] ملازم رکھ سکتا ہے۔

شمشیر بہادر ۱۱ اگست ۱۸۲۳ء (مطابق ۳ ذی الحجہ ۱۲۳۸ھ) کو لاولد فوت ہوا۔ اس کے بعد اس کا چھوٹا سوتیلا بھائی ذوالفقار بہادر اس کا جانشین ہوا۔ جب ذوالفقار بہادر کا بھی ۱۸۵۰ء میں انتقال ہوگیا تو اس کا بیٹا علی بہادر (ثانی) اس کا وارث ہوا۔

(۲)

۱۸۵۷ء کا مشہور ہنگامہ علی بہادر ثانی کے زمانے میں ہوا اور وہ بھی

(پچھلے صفحے سے آگے) کہ اس لڑکے کا نام شمشیر بہادر تھا اور علی بہادر اس شمشیر بہادر کا بیٹا اور مستانی کا پوتا تھا۔ چونکہ شمشیر بہادر عین جوانی میں فوت ہو گیا اور اس کی شہرت ملک میں عام نہیں ہو سکی تھی، اس لئے جب لوگوں نے علی بہادر کو دیکھا اور اس کا نام سنا تو یہی خیال کیا کہ وہ مستانی کا بیٹا ہے۔ حالانکہ یہ بات غلط تھی۔

۱؎ ثمر خلافت جاوید (ج ۲)، ص ۳۰۳

۱؎ "تاریخ بندیل کھنڈ" [illegible] (۱۸۵۳ء) ص ۹۰۔ [illegible] مرتبہ ولیم ہیل [illegible] میں تاریخ [illegible] اگست لکھی ہے۔ یہ ٹھیک نہیں۔

۲؎ "تاریخ بندیل کھنڈ" [illegible] کے حاشیے میں کسی نے [illegible] عبارت لکھی ہے: "[illegible]" تھا۔ [illegible] انگریزوں نے منظور کیا [illegible] شمشیر بہادر کی بیوی [illegible] کے علاوہ اس کی ایک حرم بھی تھی۔ اس کا نام "[illegible]" تھا۔ [illegible] اسی کا بیٹا ہو۔

۳؎ بعض تحریروں میں اس کا نام ذوالفقار علی لکھا ہے۔ [illegible] درست نام ذوالفقار بہادر ہی تھا۔

جگن ناتھ آزاد

اے وادیٔ کشمیر

جلوہ ترا محبوبِ شہنشاہِ جہانگیر
اقبال کی تخئیل ترے دام کی نخچیر
اے وادیٔ کشمیر

اٹھتا ہوا بادل ہے کہ ہے بولتا جادو
بہتا ہوا نالہ ہے کہ ہے پاؤں کی زنجیر
اے وادیٔ کشمیر

ہر قطرۂ باراں ہے ترا کیف کا سیلاب
ہر ذرۂ خاکی ہے ترا حسن کی تصویر
اے وادیٔ کشمیر

شاداب چناروں میں یہ بہتے ہوئے دریا
پیچ و خم کے یہ دریا ہیں کہ ہے عالمِ تصویر
اے وادیٔ کشمیر

فرقت زدہ عاشق ملے معشوقہ سے جیسے
یوں ابرِ سیاہ مست ہے وادی سے بغلگیر
اے وادیٔ کشمیر

جھرنوں کی ہے آواز کہ ہے اذنِ خموشی
سبزے کی خموشی ہے کہ ہے عالمِ تقریر
اے وادیٔ کشمیر

تہذیب کے چہرے پہ بھی تاباں ہے ترا نور
فطرت کے مناظر ہی نہیں ہیں تری تصویر
اے وادیٔ کشمیر

تو ہند کے ماتھے پہ ہے اک تاجِ درخشاں
اور تاج بھی وہ تاج کہ ہے حاصلِ توقیر
اے وادیٔ کشمیر

نہرو ہے ترے معدنِ معنی کا جواہر
چکبست ترے جلوۂ صد رنگ کی تنویر
اے وادیٔ کشمیر

سپرو کی زباں تیرے تمدن کا نمونہ
ملّا کا سخن تیری ہواؤں کی ہے تاثیر
اے وادیٔ کشمیر

حسرت ہو کہ مہجور، غنی ہو کہ ہو اقبال
تیرے قلمِ کیف کی اک شوخیٔ تحریر
اے وادیٔ کشمیر

اٹھیں گے ابھی اور تری خاک سے فنکار
کرنا ہے ابھی اوروں کو تجھے تسخیر
اے وادیٔ کشمیر

جو دل پہ چمکتا ہے پہاڑوں سے ابھر کر
بن جا اُسی خورشیدِ جہاں تاب کی تنویر
اے وادیٔ کشمیر

چمکے ترے باغوں کا شباب اور زیادہ
کچھ اور فزوں تیری بہاروں کی ہو تاثیر
اے وادیٔ کشمیر

آباد ہو کچھ اور ترا درد دلوں میں
کچھ اور دماغوں میں ہو پختہ تری توقیر
اے وادیٔ کشمیر

تاثیر وہ اک تیری ہواؤں کو ملی ہے
جو خاک کو تریاق کرے زہر کو اکسیر
اے وادیٔ کشمیر

اللہ کرے جلد وہ دن آئے کہ جس دن
چمکے تری دنیا پہ مرے فکر کی تنویر
اے وادیٔ کشمیر

محمد صدیق لکھنوی

تذکرہ فرح بخش

بھوپال کا علمی پس منظر

بھوپال وسط ہند کی ایک مشہور ریاست ہے جس کی بنیاد ۱۷۲۲ء میں امیر دوست محمد خاں نے ڈالی۔ یہ ریاست ہندوستان میں کئی وجوہ سے شہرت اور اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ انھیں وجوہ میں ایک بڑا اور نمایاں سبب اس کے فرماں رواؤں کی علم پروری اور ادب نوازی، علماء کی قدردانی اور ادیبوں اور شاعروں کی بلند حوصلہ افزائی اور بہت آؤ بھگت ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو جگہ جگہ سے کمال و ہنر کے پرستاروں کو اور گوشے گوشے سے علم و دانش کے خدمت گزاروں کو کھینچ کر لاتی ہیں۔ انھیں معاشی فراغ بالی اور سکون خاطر بہم پہنچاتی ہیں۔ ان کے جوہر کھلتے اور کمالات کے چشمے ابلتے ہیں۔ انھیں کی بدولت شہر و دیار علم و ہنر کا مرکز بن کر مشہور ہوتے ہیں اور ان کے فرماں رواؤں کو حیات جاوید عطا کرتے ہیں۔

اسی فطری اصول کی بنا پر بھوپال نے اپنے دور ماضی میں نمایاں مرتبہ حاصل کیا خاص کر تقریباً ایک صدی پہلے ہندوستان ہی نہیں بلکہ عرب و عجم اور ایشیا غرض کہ دنیا بھر میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کر لیا تھا۔

اگرچہ تمام دیسی ریاستوں کی طرح اس کا ابتدائی دور بھی بہت پُر آشوب صبر آزما کشمکش زندگی اور طوائف الملوکی کا دور تھا۔ لیکن جس وقت جتنی فرصت ملتی گئی یہاں کے حکمراں اپنی ریاست کی تعمیر و ترقی اور علم و ہنر کی حوصلہ افزائی پر توجہ فرماتے گئے اور دور بدور یہ ذوق بڑھتا رہا۔ بالخصوص نواب شاہجہاں بیگم کا آخری دور حکومت پوری ریاست کی تاریخ کا سب سے زیادہ روشن سب سے زیادہ تابناک بن گیا۔

اس شہرت کا خاص سبب

اس کا تمام تر سہرا بیگم کے دوسرے شوہر نواب سید صدیق حسن (خاں) مرحوم کے سر ہے جو علمی دنیا میں خود بھی بلند درجہ رکھتے تھے۔

۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں بیگم سے ان کا عقد ہوا۔ اسی تاریخ سے بھوپال کی علمی ترقی اور شہرت کی داستان شروع ہوتی ہے۔ نواب صاحب مرحوم کے ایما سے اہل علم و ادب کی قدردانی کے لئے بیگم صاحبہ نے خزانے کے دروازے کھول دیے۔ بیگم اور نواب دونوں نے مل کر اس چھوٹی سی ریاست کا آوازہ تمام ہندوستان تک پہنچا دیا۔ علم و ادب کے جتنے چشمے بھی ہو سکتے تھے سب کھل گئے۔ علماء اور شعراء بکثرت جمع ہو گئے۔ اس وقت علمی و ادبی زبان کی حیثیت سے فارسی زبان کا غلبہ تھا مگر اُردو بھی ابھر رہی تھی اور فارسی کو دباتی جاتی تھی۔ غرض کہ ہر علم و فن کی کتابیں اُردو فارسی عربی تینوں زبانوں میں بکثرت تصنیف و تالیف اور طباعت کے زیور سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آنے لگیں۔

بھوپال اور شعراء کے تذکرے

ایسے زمانے میں یہ خیال ہونا ناگزیر تھا کہ شعراء کے تذکرے بھی لکھے اور شائع کئے جائیں۔ پھر عہد ادب کا یہ گوشہ بھی سامنے آنا ضروری تھا کہ فارسی زبان کے شاعروں کے تذکرے لکھنا ہی کافی اور قرین انصاف نہیں بلکہ اُردو زبان کے شاعر بھی جو اطراف میں ہیں ان کے حق میں بھی کچھ ان کی حیات جاوید کا سامان کیا جائے۔ اسی خیال کی تائید سے تذکروں نے مزید تقویت دی جو شمالی ہند میں ... تھا نصف صدی پہلے تصنیف ہو کر شائع ہو چکے تھے۔ غرض اُردو کا کام بھوپال میں شروع ہو گیا۔ مگر ترجیح فارسی ہی کو رہی۔

ہی۔ حالاں کہ زمانہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اب اس ملک میں اس زبان کا مستقبل کیا ہے۔ بہرحال اب تک یہاں کے تصنیف شدہ تذکرے جتنے بھی مجھے ملے ہیں ان کی تعداد بارہ ہے ان میں دو کے سوا سب فارسی زبان میں ہیں۔

اُردو کا پہلا تذکرہ

عجیب اتفاق ہے کہ سب سے پہلا تذکرہ اُردو زبان میں لکھا گیا۔ اس کا سن طباعت ۱۲۹۰ھ، "تذکرۂ فرح بخش" نام ہے۔ اسے تذکرہ تو کیا بیاض کہنا چاہئے یہ تذکرہ صرف ایک رات میں تصنیف ہوا ہے۔ حجم کے لحاظ سے سب سے چھوٹا اور عمر کے لحاظ سے سب سے بڑا ہے۔ گویا بھوپال کے تذکروں کا باوا آدم ہے اور "اَلْفَضْلُ لِلْمُتَقَدِّم" کے مصداق اس کو وہ برتری حاصل ہے جو بزرگوں کو اپنے چھوٹوں پر حاصل ہے۔ اگرچہ عمروں میں زیادہ تفاوت نہ ہو۔

اس کے مصنف نواب یار محمد خاں شوکت ہیں اور میرا خیال ہے کہ یہاں تذکرہ لکھنے کا خیال سب سے پہلے انھیں کو ہوا۔ اسی تذکرے نے نواب سید صدیق حسن (خاں) پھر ان کے بعض معاصرین کو تذکرے لکھنے کا شوق یا احساس دلایا۔

یہ تذکرہ مطبع نظامی کانپور میں چھپا ہے جو کسی زمانے میں ہندوستان کا مشہور اور نامور مطبع تھا۔ کتابت چھپائی کی عمدگی اور صحت کے لحاظ سے اس مطبع نے بڑا نام اور بلند مقام پیدا کر لیا تھا۔

تذکرۂ فرح بخش کا سائز ۲۰×۳۰/۸ ہے جو اس دور کا مقبول عام اور پسندیدہ سائز تھا اور تمام تذکرے بھی اسی سائز پر ہیں۔ پہلے صفحے پر جسے سرورق یا لوح کہتے تھے، یہ عبارت ہے گول دائرے کے اندر نام (تذکرۂ فرح بخش) نام کے نیچے ۱۲۹۰ھ لکھا ہے۔ نام کے آس پاس دائرے کے اندر یہ عبارت ہے: "از تالیفات جناب شاعر شیریں مقال، قمری سرو جویبار نازک خیالی، عندلیب شیریں نوا چمن فطرت، جناب یار محمد خاں بہادر متخلص بہ شوکت، گلدستۂ از ... سوائے نقش یعنی (تذکرۂ فرح بخش)" حجم ۹۰ صفحات ہے اور ہر صفحے میں نہایت جلی قلم سے صرف سات سطریں ہیں۔ خط پاکیزہ اور چھپائی عمدہ ہے۔ عبارت قافیہ دار ہے اور یوں آغاز ہوا ہے "زہے گلشن دل ... ارباب ... نشاط افزائے قلوب احباب ... بنا کی ہے۔"

یہ ہے اس وقت کی عبارت اور شاعرانہ اُردو جس میں بس ایک لفظ ہے کھرا اور کوئی لفظ اُردو کا نہیں آیا۔ کتاب کی تصنیف کا سبب بھی مصنف ہی کی زبان سے سن لیجئے:-

"بندۂ احقر بندۂ درگاہ رب العزت یار محمد خاں شوکت گزارش کرتا ہے۔ ... دل کو گزارش کرتا ہے۔ بچپن و شباب سے شعر و سخن کا شوق ہے۔ تمام و انواع کلام موزوں سے دل کو نہایت ذوق ہے۔"

اس انداز کلام سے شاید آپ کی طبیعت اکتا جائے اس لئے بقیہ مضمون اپنے رنگ میں پیش کرتا ہوں۔

۱۲۹۰ھ میں شب برات کے چھٹے روز چودہ تاریخ کو سیر کے لئے باغ فرح بخش گیا۔ دل کشا سبزہ زار اور فرحت افزا آبشاروں کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ میر تقی میر کا یہ شعر یاد آیا۔

میر نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے
نام خدا ہو جواں کچھ تو کیا چاہئے

اس کو بار بار پڑھتا ہوا بزم سرور گھر پہنچا۔ ... عاشقانہ اشعار دیکھنے کو جی چاہا۔ اسی عالم سرور میں میں نے قلم دوات منگوایا اور اپنی بیاض سے چند ہوبہو نازک خیال شاعروں کے اشعار چن ڈالے۔ ایک ہی رات میں یہ تذکرہ تیار ہو گیا جس پر گلشن کشمیر کو رشک ہو تو بجا ہے۔ فرح بخش نام ہے۔ "نشاط افزا گلشن مسرت" (۱۲۹۰) اس کا تاریخی نام ہے۔ اس کے چار باب ہیں۔ اور ہر باب کا نام گلشن ہے۔

۱۔ پہلے گلشن میں ان شاعروں کا حال ہے۔ جو بیرونی ممالک کو چھوڑ کر بلدۂ بھوپال میں ہیں۔

۲۔ دوسرے گلشن میں وہ شاعر مذکور ہیں۔ جو یہاں تھے مگر اب منتقل ہیں۔

۳۔ تیسرے گلشن میں ان شعراء کا بیان ہے جو یہاں حکومت کے ملازم تھے مگر اب یہاں نہیں اور کہیں چلے گئے۔

۴۔ چوتھے گلشن میں ان نامی ادیبوں کا حال ہے۔ جن کے وجود سے ہندوستان کا چمن نادیک بے خار ہے۔

ان ۹۰ صفحوں میں کل چھپن شعراء کے نام مختصر حالات اور بچا کھچا تھوڑا سا کلام ہے۔ سب سے پہلے فرماں روائے بھوپال نواب شاہجہاں بیگم کا ذکر ہے پھر ان کے وزیر اعظم مدار المہام مولوی جمال الدین خاں کا کلام ہے۔ جن کا تخلص جمال ہے۔ ان کے بعد نواب سید صدیق حسن (خاں) کا بیان ہے۔ باقی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سید علی حسن عزیز

۲۔ ... (تخلص نہیں لکھا)

۳۔ محمد عسکری (تخلص نہیں لکھا)
۴۔ محمد عباس۔ رفعت
۵۔ شوکت۔ مصنف
۶۔ نواب جہانگیر محمد خاں۔ دولہ
۷۔ غلام عباس۔ کرم
۸۔ حبیب احمد۔ وحدت
۹۔ عبدالواحد۔ مسکین
۱۰۔ امداد علی۔ امداد
۱۱۔ سید حسین شاہ۔ واصف
۱۲۔ یمین الدین احمد معروف بہ مولوی بخاری۔
۱۳۔ عبدالعلی۔ ذاکر
۱۴۔ کنہیا لال۔ نکہت
۱۵۔ نجف علی (تخلص نہیں لکھا)
۱۶۔ سید واصل علی۔ (تخلص نہیں لکھا)
۱۷۔ منشی عبدالعزیز۔ اعجاز مسیحائی

چوتھے گلشن میں

۱۸۔ مرزا غالب
۱۹۔ ہاکر صاحب (انگریز)
۲۰۔ مولوی سید شریف حسن
۲۱۔ مولوی احمد حسن۔ قنوجی (نواب سید صدیق حسن خاں) کے بڑے بھائی)
۲۲۔ مرزا دبیر۔ لکھنوی۔

اس تذکرے میں ہندوستان کے صرف دو مشہور اور نامور شاعر مذکور ہیں۔ مرزا غالب اور مرزا دبیر۔ ایک صاحب بہادر ہیں۔ ان کے حالات دو دو چار چار سطروں میں ہیں۔ حالات کیا ہیں۔ زیادہ تر شاعرانہ انداز کی عبارت آرائی، مدح سرائی اور صفت زیادہ مبالغہ فرمائی ہے۔

۲۹ ذی الحجہ ۱۲۸۵ھ کو اس تذکرے کی طباعت ختم ہوئی۔ آخر میں مولوی حافظ عبدالرحمٰن خاں شاکر مالک مطبع نظامی، امجد مسیح وانی اور دگر چند شاد نقاشؔ انجانی کے تاریخی قطعات درج ہیں۔

شوکت کی ایک کتاب شہنشاہ نامہ ہے۔ یہ شاہ نامۂ فردوسی کے وزن پر ایک مثنوی ہے۔ جس میں سرورِ کائنات حضرت پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات (لڑائیوں) کے تاریخی حالات نظم کئے ہیں۔ ۱۲۹۶ھ میں تالیف اور مطبع حسینی یا مدید سکندری ریاست رام پور میں چھپی ہے۔ اس کے آخر میں مصنف کے حالات لکھے ہیں۔ لکھنے والے کا نام نہیں لکھا۔ عنوان یہ ہے:-

"خاتمہ مشتمل بر احوال شوکت صاحب کمال"

یہ بہت مختصر مگر صحیح حالات ہیں۔ خلاصہ یہ کہ یار محمد خاں شوکت ریاست بھوپال کے بانی دوست محمد خاں کی پانچویں پشت میں ہیں۔ ۲۹ صفر ۱۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے اور کمال ناز و نعمت سے پرورش پائی۔ نواب فوجدار محمد خاں کے بیٹے تھے۔ فوجدار محمد خاں، نواب قدسیہ بیگم کے سگے بھائی اور سکندر بیگم کے ماموں تھے۔ نواب شوکت اس رشتہ سے نواب شاہ جہاں بیگم کے ماموں اور سلطان جہاں بیگم کے نانا ہوتے ہیں۔ انھوں نے بہت اختصار کے ساتھ اپنے تعلیمی حالات لکھے ہیں۔ کم سنی ہی کے آغاز سے علوم و فنون کی جانب طبیعت راغب ہے۔ میں نے نہایت شوق سے اپنے خطے کے ارباب کمال کی خدمت میں سیف و قلم کے کمالات حاصل کئے۔ استادوں کے نام یہ ہیں۔

نواب شوکت کے اساتذہ

۱۔ مولوی سید عبداللہ متوطن خوشاب (پنجاب) یہ اس دور کے بزرگ ترین اور مشہور عالم اور بڑے بافیض بزرگ تھے۔ بھوپال کے بہت سے اہل علم و کمال اور ادبا پر شعر و ادب ان کے شاگرد تھے۔

شوکت اپنی کتاب گلدستۂ نرگس میں (صفحہ ۱۳۱) پر ان کی نسبت لکھتے ہیں:-

"جناب استاذی، ملاذی، اشرف کمالات انسانی، مصرع علامۂ دورانی مولوی سید عبداللہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔"

لے نقاش لکھنوی بہت اچھے خوشنویس اور بڑے ہی شاعر تھے لکھنؤ میں رہتے تھے۔ نول کشور پریس لکھنؤ اور نظامی مطبع کانپور کا اکثر کام کرتے تھے۔ غالباً اس تذکرے کی کتابت انھیں نے کی ہے۔ نقاش کی ایک نایاب مطبوعہ مثنوی راقم کے کتب خانہ میں ہے جس کا نام گلزار نقاش ہے۔ نقاش کے قطعۂ تاریخ طباعت ان کے مطبوعہ دیوان کے آخر میں ہیں۔

۲۔ منشی احمد علی احمد۔ یہ بوہرہ قوم کے ایک فاضل تھے۔ شاعر و باکمال خوشنویس تھے۔ ان سے فنون ادب اور آداب مجلس اور علم طب کی تعلیم پائی۔ ان دونوں استادوں سے عربی فارسی کی درسی کتابیں پڑھ کر استعداد اور قابلیت پیدا کی۔

انشائے نو خیز چشم میں لکھتے ہیں:-

"منشی احمد علی خلف ملا اسماعیل صاحب خط نسخ و شکستہ و نستعلیق کے ماہر اور منشی زبردست شاعر ہیں۔ والد کے پیر منشی تھے اور میرے استاد ہیں اپنے وقت کے بے نظیر ہیں (صفحہ ۸۰)"

۳۔ میر اکبر علی خاں غازی خلف میر عابد علی خاں نبیرۂ نواب میر حیدر علی خاں غازی دہلوی سے آداب مجلس، فن طبابت اور آئین سیف بازی کی تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے ۱۲۸۸ھ میں بمقام سیہور وفات پائی۔ نواب شوکت اپنی تصنیف انشائے نو خیز چشم میں صفحہ ۸۰ پر لکھتے ہیں۔

"میرے شفیق استاد کا انتقال ہوا۔ مجھ کو نہایت رنج و ملال ہوا۔ خدا غریق رحمت کرے۔ ان کو داخل جنت کرے۔ واقعی اس واقعہ سے جی اداس ہے۔ یہ تاریخ ان کی رحلت کی مجھ زار مولانا عباس ہے (قطعہ)

میر عالی نسب اکبر علی — از طفیل مصطفیٰ مغفور باد
رفت از دنیا بسوئے آخرت — زیر طوبیٰ ہم نشین حور باد
گفت عباس حزیں تاریخ او — با امام المتقین محشور باد

۱۲۸۸ ہجری

۴۔ سکندر محمد خاں۔ رسالدار۔ جو سرکار شاہجہاں بیگم کے باڈی گارڈ یا اردلی خاص کے رسالدار تھے۔ ان سے گھوڑے اور ہاتھی پر سوار ہونے کے آداب سیکھے۔

۵۔ مولانا محمد عباس رفعت شروانی۔ اس دور کے نامور فاضل اور فارسی کے زبردست عالم اور بہت سی اردو فارسی کتابوں کے مصنف تھے۔ تاریخ گوئی سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ غالب کے شاگرد تھے۔

نواب شوکت انشائے نو خیز چشم (صفحہ ۹۰) میں لکھتے ہیں:-

"مولانا و بالفضل اولانا خلف الشیخ الشہیر الیافی احمد بن محمد الشروانی خفیہ اللہ کیا س، استادی محمد عباس المتخلص بہ رفعت سلمہ اللہ رب العزت"

اس کے بعد مولانا عباس کی ۱۲ تصانیف کے نام لکھ کر تحریر کرتے ہیں:-

"رسائل مذکور گواہ کمالات ادبیہ مسطورہ ہیں۔"

۱۔ شوکت۔ نواب یار محمد خاں۔ مالک رام صاحب نے جو سلسلہ مضامین "تلامذۂ غالب" کے عنوان سے ماہنامہ رسالہ ادب (علی گڑھ) میں لکھا تھا شوکت کا ترجمہ اس میں موجود ہے (اردو ادب جولائی ۱۹۵۱ء ص ۱۲۳)۔

۲۔ شوکت کے والد نواب فوجدار محمد خاں ہی وہ شخص ہیں جن کے کتب خانہ سے وہ قلمی نسخہ دیوان غالب (اردو) دستیاب ہوا تھا۔ جو نسخۂ حمیدیہ کے نام سے چھپ گیا ہے۔ اس وقت تک یہ غالب کے اردو دیوان کا قدیم ترین نسخہ ہمارے پاس ہے۔

۳۔ شوکت نے لکھا ہے کہ جب میرے استاد میر اکبر علی خاں کا انتقال ہوا تو مولانا محمد عباس رفعت نے قطعہ تاریخ وفات لکھا۔ لطیفہ یہ ہے کہ جب اسی سال (۱۲۸۸ھ) نواب والاجاہ سید محمد صدیق حسن خاں بہادر کے بڑے بھائی سید احمد حسن قنوجی کا انتقال ہوا تو رفعت نے خفیف سے تصرف کے بعد یہی تاریخ ان کے نام کر دی قنوجی بھی غالب کے شاگرد تھے۔ تاریخ یہ ہے

قطعہ

قنوجی عالی گہر احمد حسن — از طفیل مصطفیٰ مغفور باد
رخت بربست از جہاں سوئے بہشت — زیر طوبیٰ ہم نشین حور باد
گفت رفعت از پئے تاریخ او — "با امام المتقین محشور باد" ۱۲۸۸

۴۔ شوکت نے اپنی تصنیف "انشائے نو خیز چشم" میں غالب کی تصنیفات کے جو نام لکھے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کہیں سے سن کر یہ فہرست لکھ دی ہے اور خود کتابیں نہیں دیکھیں۔ اس سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔

(ا) غالب نے "ماہ نیم ماہ" لکھی نہ یہ شائع ہوئی۔ ان کی تجویز یہ تھی کہ "مہر نیم روز" کا دوسرا حصہ اس نام سے لکھیں گے۔ لیکن کتاب لکھی نہیں گئی۔

(ب) "گوہر افشاں" اور "معانی تعبیر" غالب کی کسی تصنیف کا نام نہیں۔ یہ محض شوکت کی دماغی اختراع ہے۔

(ج) اسی طرح "غالباً سبد چین" کی تصنیف ہے۔ "سبد چین" چھپ چکی ہے۔ اس میں غالب کا فارسی کلام ہے۔

(ادارہ)

۴۔ مراسلات شوکت
۵۔ چار باغ شوکت
۶۔ شہنشاہ نامۂ شوکت
۷۔ انشائے نو چشم
۸۔ ہفت خوان شوکت
۹۔ گلزار ادبی شوکت
۱۰۔ باز نامہ
۱۱۔ فرس نامہ
۱۲۔ فیل نامہ

نواب شوکت کی ایک کتاب "ہفت خوان شوکت" ہے، یہ بھی ان کی اکثر تصانیف کی طرح اردو میں ہے اور مطبع حسینی رام پور میں چھپی ہے۔ اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کھانوں کے بڑے شوقین تھے۔ کھانے عمدہ عمدہ کھاتے اور پکواتے تھے۔ ان کے یہاں بہترین پکانے والے ملازم تھے۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی اپنے شوق سے کبھی کبھی کوئی چیز پکایا کرتے تھے۔ ان کا دسترخوان وسیع اور پر تکلف رہتا تھا۔ خوش حال اور فارغ البال تھے۔ خوش حلیت تھا۔ سیر چشمی اور فیاضی فطرت نے عطا کی تھی۔ اس کتاب کے آغاز میں حمد و نعت کے بعد لکھتے ہیں:

"اما بعد بندۂ درگاہ رب العزت یار محمد خاں شوکت بتفضل تعالیٰ از آبا و اجداد (باپ دادا کے زمانے سے) مرفہ الحال فارغ البال ہے اور شوق اطعمہ (طعام کی جمع) لطیفہ و ذائقہ لذیذ (غذا کی جمع) لطیفہ میں بے قیل و قال ہے۔ جس قدر کھانے کھائے اور شوقیہ خود پکائے ان کو ان اوراق خوش طرز پاک لوگوں کے لئے لکھ دئے اور اکثر کھانے جن کا پکانا اور خاطر خواہ روپیہ صرف کر کے کھلانا دشوار ہو، بعض علی العموم کھانوں کا لکھنا بیکار ہے، متروک کیے۔ جو صاحب ان میں سے کسی کھانے کو کھا کے حظ و لذت اٹھائیں مؤلف کو بدعائے خیر یاد فرمائیں اور نام اس کا ہفت خوان شوکت ہے۔ .... یہ رسالہ سات فصل پر مشتمل ہے۔"

صفحہ ۳۱۹ پر دسترخوان آراستہ کرنے کی ترکیب و تہذیب ملاحظہ ہو:

"اول مکان لطیف و مصفا، جھاڑ فانوس سے مجلا و روشن، تجویز کر کے دسترخوان صاف لطیف، شطرنجات، دریاں بچھا دیں، اور آلات روشنی اور گلدستہ گلہائے خوشبودار و رنگین اس پر نصب کر کے اس پر کھانا طرح طرح کے ظروف چینی، نقرئی و کاشانی و دودمی و بلوری میں دسترخوان پر چن کر اہل دعوت کے ہاتھ پاک کرا کر اوپر دسترخوان کے دو زانو مؤدب بٹھا دیں، اور اجازت تناول طعام کی دیں، اور مردم انتظام سرو پاکیزہ لباس دیکھتے جاویں کہ جس چیز کی طعام اور آب سے حاجت دیکھیں، طعام لطیف اور خوشبودار آگے مہمان کے حاضر لا دیں۔ جب سب طعام سے فارغ ہوں، صابون اشنان سے ہاتھ صاف کرائیں اور محفل میں لا کر بٹھائیں اور چائے اور قہوہ پیش کریں، اور رقص ناچ دکھائیں اور بعدہ تحفہ جات ولایتی و ہندوستانی کے گذرانیں اور عطر و پھول پان و گلوریاں دے کر ان کو ادا کر کے رخصت فرما دیں۔ زیادہ والسلام۔"

شوکت کی تحریروں اور ان کی نسبت دوسروں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے شرفاء اور رئیسوں میں جو جو خوبیاں اور کمالات ہوتے تھے، وہ سب نہیں تو اکثر نواب شوکت میں موجود تھے۔ وہ خوب صورت، تنومند اور تمام مردانہ حسن سے آراستہ تھے۔ دوہرا بدن، داڑھی مقطع اور خوشنما، خوش لباس، خوش پوشاک، کھانے عمدہ عمدہ کھاتے، پکواتے اور اپنے احباب اور مہمانوں کو کھلاتے تھے۔ طالب مختلف مقامات سے ان کے احباب اور صاحب حاجت و طالب امداد لوگ ان کے یہاں آتے رہتے تھے۔ نواب شوکت اپنی اور ان کی حیثیت کے موافق خاطر مدارات کرتے، مالی امداد اور انعام و اکرام سے سرفراز فرماتے۔ سخی، دریا دل، سیر چشم رئیس تھے۔ بہادری، شہسواری اور فنون سپہ گری میں بھی ماہر تھے۔ شکار کے بھی شوقین، رقص و نغمہ کے قدردان اور رسیا۔ اسی کے ساتھ اپنے دور کے اچھے ادیب اور انشا پرداز مصنف اور عالم و فاضل تھے۔ فن طب اور خوشنویسی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے والد نے ان کو اچھے اچھے استادوں سے ان فنون میں تعلیم و تربیت دلوائی تھی۔

اُردو کے دلدادہ تھے۔ ان کی تمام تصانیف اردو میں ہیں۔ نظم میں کم اور نثر میں زیادہ ہیں۔ عبارت قافیہ دار کم اور سادہ زیادہ ہے۔

آخر عمر میں دبلے پتلے ہو گئے تھے اور غالباً دماغ میں بھی کچھ خرابی آ گئی تھی۔

آخری دورِ حیات

واقف المرحوم دہلوی نے اپنے بچپن اور ان کی پیرانہ سالی میں بارہا اس انداز سے دیکھا کہ روزانہ شام کو وہ بھنڈی بازار میں ایک چکر لگاتے۔ ایک ملازم یا کوئی مصاحب ساتھ رہتا تھا۔ ہر روز نئے انداز کا لباس زیب بدن ہوتا۔ پائجامہ کبھی تنگ موری کا پائنچے ہوتے اور کبھی چوڑے پائنچوں کا۔ کبھی چوڑی دار گھٹنا اور کبھی پتلون، کبھی بریچس۔ پائجامہ کا ایک پائنچہ سرخ، ایک کاسنی، اور ایک پیر تو ایک رنگ دار پیلا۔ انگرکھے کی آستین میں چاک۔ ایک سلیم شاہی جوتا نیلے مخمل کا تو ایک لال مخمل کا۔ ایک پیر تو ایک سرخ اسی طرح موزے بھی دو رنگ کے ایک سیاہ ایک سفید وغیرہ۔ کبھی سر پر پگڑی کبھی عمامہ کبھی کلاہ، گول مخمل کی ٹوپی، اور کبھی سبز جالی کی ٹوپی۔ کبھی ریشمی کام کی کبھی دیہوری کشتی نما، کبھی دو پلی اور کبھی چوگوشیہ کرکی۔ داڑھی چڑھی ہوئی۔ کبھی سفید کبھی مہندی کے خضاب سے سرخ۔ گول مقطع۔ کبھی دراز اور کبھی گول مختصر۔ جھکے والی جسم چھریرا، قد میانہ، چہرہ کتابی۔ ناک قدرے چھوٹی، رنگ گورا۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ جوانی میں بڑے رنگین مزاج تھے اور رقص و نغمہ کے دلدادہ، حسن و جمال کے پرستار تھے۔ آخر کو بیوی بچے کو چھوڑ کر ۱۸ ماہ اگست ۱۹۱۲ء میں وفات پائی۔

آئندہ اشاعت کے متوقع مضمون نگار

دلاور زبید مانی — عرشی رامپوری
عابد جمیل — عائشہ
دل شاہجہاں پوری
منور لکھنوی
[illegible] — شاد عارفی

شاذ تمکنت

مریم نغمہ

شکوۂ شب بے محل ورنہ یہ میٹھا انشا
چاند کے سینے میں تو ہوتا ہے شگفتہ کنول
رس میں ڈوبا ہوا، شہ نال سے بوجھل بوجھل

•

منظرِ خواب تنہا ہے تو وہ ساز کھلے
پھر سرِ بزم مرا بھید مرا راز کھلے
مریم نغمہ تری لَے میں ہے تنویرِ شفا
ساز کے سینے پہ گھونٹوں میں دبی ہیں چوٹیں
سُر کے زخموں پہ کوئی نور کا پھاہا رکھ دے
باندھ ہر تار کے اطراف اُجالے کا حصار
تری مُرکی کے چرن چھو کے کلیجہ رکھ دے
آنکھ کو حسرتِ تو نشت یہ فشانی نہ رہے
ضبطِ فریاد کی بھی کھوں کے رسوائی کر
ساز یوں چھیڑ کہ اشکوں کو بہانہ مل جائے
یوں دُکھا دل کہ تسلی کا گماں ہو جس پر
تری آواز ہے وہ کیا تری سانسیں ہیں بہار
کتنی لَے سی لگی ہے ترا وہ شعر باتوں میں
جیسے کھلتے ہیں ہو ساون کی جھڑی میں جگنو
نور اس طرح چھلکتا ہے ترے تانوں میں
رُخ نرگس پہ مانگ سکوں، جلوہ وہ ورد نشاط
لب ساکت پہ بھی مستانے کے چھیڑنے کا گماں

دیکھ کر آنکھوں کو یہ جاگتا سوتا سنسار
آکے رس بن گئیں بدمست اچھل راگنیاں
تجھ کو سنگیت کی دیوی نے دعائیں دے کر
مسکراتے ہوئے رنگوں کی فراوانی میں
نُور کے رستوں سے بھیجا ہے کرن کے مانند
راگ کے سائے میں سرگم کی نگہبانی میں

•

بارہا خواب کے ہنگام یہ محسوس ہوا
میرے انفاس میں پڑتے ہیں اُجالے کے بھنور
راگنی پیار سے تکتی ہے سرہانے آ کر

•

جب بھی بھیگے ہوئے سرشار ہوا کے بادل
پیار سے ٹوٹ کے بدمست چلے آتے ہیں
جی میں جو جاتی ہیں شرمیلی ہوائیں پاگل
لبِ احساس پہ جم جاتی ہے گہرے کی تھکاس
نیند بن جاتا ہے آنکھوں میں دھندلکے کا غبار
برگ سے اٹھتی ہے جب بوند کی پہلی جھنکار
پوچھتا ہے کوئی پیچھے سے مسیحا بن کر
تو کسی ساز کا بچھڑا ہوا نغمہ تو نہیں
کسی مضراب کے سینے کا شرارہ تو نہیں

•

اُن سنی راگنی پیچھے کو سناتا ہے یہ کون
جب فضاؤں سے برس پڑتے ہیں نغمے طرب
ڈوبتا ہے مرے درد کا قصہ آخرِ شب
موج میں نقش کے تاروں میں بدل جاتی ہیں
چرخ پر لگتا ہے جب اختر فیوں کا انبار
چوٹیاں کوہ کی سونے سے پگھل جاتی ہیں
کھلنے لگتے ہیں سرِ آبِ رواں نیل کنول
صف بہ صف بھونرے چلے آتے ہیں بیکل بیکل
خود بخود جیسے کہیں بھیرویں چھڑ جاتی ہے
چاندنی آخری کرنوں کی صدا آتی ہے

•

کچھ سرِ سبز ہیں آئینِ خزاں کے ہاتھوں
منہ چھپائے ہوئے دامانِ مزار گُل میں
سسکیاں بھرتی ہے جس وقت پپیہے کی پکار
جیسے تھم تھم کے سسکتی ہے ہوائے گلزار
پیکرِ شاخ سے جب زرد سا گل آتا ہے
شیونِ برگِ چکیدہ سے چمن گونجا ہے
لے چلے موجِ نسیمِ سحری کے ہمراہ
تتلیاں ست رنگی سوغات لیے آتی ہیں
دیکھ کر خیرہ فسردہ حسن کا انجام
خس و خاشاک سے گھبرا کے پلٹ جاتی ہیں
ایسے ہنگام کہیں باغ کی دیوار کے پاس
زرد سی راگنی آ کے کھڑی رہتی ہے
ایک اک پھول کے تختے کی کتھا کہتی ہے

•

میں نے کس کس طرح سنگیت کی پوجا کی ہے
آسرا کس کا تھا نغمات کے دامن کے سوا
سوچتا ہوں کہ اگر سُر نہ سہارا دیتا
وحشتِ یہ وہ غمِ دنیا کی گراں باری تھی
سانس اُکھڑ جاتی مری فلک کے کہیں سوچا
ریزہ ریزہ آسیۂ شام و سحر ہو جاتا

نسبتِ درد ہے کچھ جنبشِ مضراب کے ساتھ
کوئی چپکے چپکے جلاتا ہے پسِ پردۂ ساز
مجھ سے یہ کس نے کیا سات سُروں کا پردہ
میرے دکھ درد کا یہ کون شناسائی ہے
کون غمخوار ہے یہ کس کی مسیحائی ہے

•

ساز پر اُنگلیاں جس وقت رواں ہوتی ہیں
دل کی دیوار سے سر پھوڑ کے آ پھرتا ہے کوئی
ایسا لگتا ہے جلے کو ہیں میرے دن رات
جیسے مٹی مری اکسیر میں ڈھل جائے گی
قند ہے جیسے مرے حق میں مرا زہرِ حیات
زندگی گردشِ دوراں سے نکل جائے گی

•

اُف یہ مرمر کے جیئے جانے کی بے سود لگن
حبسِ دہر میں کیا قہر ہے سانسوں کی گھٹن
بے سبب دل کو گماں ہوتا ہے جیسے تُو نے
میرے اشکوں مری آہوں کا سماں دیکھا ہے
تو نے دیکھی ہے مری رات کی غم گشتہ سحر
میری بجھتی ہوئی شمعوں کا دھواں دیکھا ہے
تجھ پہ آئینہ ہے جیسے مرا مجروح شباب
تجھ سے پوشیدہ نہیں ہے مرے زخموں کا حساب

•

مریم نغمہ تری لَے میں ہے تنویرِ شفا
تو مری خاک کو سودائے پرافشانی دے
وحشتِ ہستی کو تمنائے گریبانی دے
ستم سے بھٹکا ہوا ہوں کہاں جاؤں بتا دے مجھ کو
سینۂ ساز میں چپ چاپ سلا دے مجھ کو
اپنی آواز کے شعلوں میں جلا دے مجھ کو
جی میں ہے ٹھہرے ہوئے خوابوں کی تعبیر سے
راگ کی آگ میں جل بجھنے کی تقدیر لے

•

میں انتظام ہو گیا۔ قلعہ سے پلک بھر کے ٹونک چار میل مسافت کو گھیر دیا گیا
اور اس اہتمام سے بیگم صاحبہ کی سواری کی پردہ داری کی گئی۔ بیگمات کا قلعہ سے
سے باہر جانے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ بہر طرف سراج الدولہ کی خوشنودی کی خاطر ملحوظ رکھا گیا۔

سراج الدولہ کا عقد نواب صاحب کے ایما سے صاحبزادہ احمد یار خاں
کی بیٹی سے ہو گیا تھا۔ صاحبزادہ احمد یار خاں امیر الدولہ نواب امیر خاں کے
داماد تھے۔ ان کے والد کا نام زمان خاں تھا۔ زمان خاں کے دادا نواب امیر الدولہ
کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے۔

صاحبزادہ احمد یار خاں کو اشرف الامراء امیر الملک کا خطاب تھا۔ ان کا
انتقال ۱۸۶۳ء میں ہوا۔ صاحبزادہ عبدالرحمن خاں مرحوم مصنف "وقائع امیر"
کے فرزند تھے۔ ان کی ذریت و اولاد میں صاحبزادہ خلیل الرحمن خاں، شفیع الرحمن
خاں اور صاحبزادہ حبیب الرحمن خاں حیات ہیں۔

سعیدیہ کتب خانہ ٹونک میں (جو اب ڈائرکٹوریٹ لائبریری ہے) بزبان فارسی
"دو ماہ بقیہ سالہ امیر و بیت سالہ وزیر" کے نام سے ایک قلمی رسالہ ہے۔ جس کی تصنیف
سرکاری ملازم سید حسن ریزیڈنٹ راجستھان کی تحریک پر عمل میں آئی۔ اس رسالہ
میں سراج الدولہ کے حالات تفصیل سے درج ہیں۔ صاحب رسالہ کا بیان ہے کہ
ان کے پیر سید احمد کا عقد صاحبزادہ فیض محمد خاں کی دختر سے ہوا۔ لیکن تاریخ
ٹونک مصنفہ سید اصغر علی آبرو سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اسی رسالہ "بقیہ سالہ
امیر و بیت سالہ وزیر" میں ہے کہ جب سراج الدولہ کا آفتاب عروج ریاست
میں اتنا ترقی پذیر ہو گیا تو انھوں نے اپنے اس اقتدار کی وجہ سے اہل فوج، اہل حرم
اور اہل خاندان پر بے جا استبداد شروع کر دیا جس کی وجہ سے ریزیڈنٹ راجستھان
تک ان کی شکایتیں پہنچنے لگیں اور وہاں سے نواب وزیر الدولہ کو توجہ دلائی گئی کہ
سراج احمد کو جاگیرات اور عطیات سے بہت زیادہ نوازا جا چکا ہے۔ عمائدین ٹونک
بالعموم اور اہل خاندان بالخصوص ان کے مظالم سے تنگ آ چکے ہیں۔ یہ خود اس قدر بہت
سی دولت حاصل کر چکے ہیں۔ جس کی وجہ سے فوج کو تنخواہ اپنے وقت پر تقسیم نہیں
ہوتی۔ ٹونک سے اخراج کرکے ان کو آگرہ بھیج دیا جائے، جاگیر ضبط کی جائے تنخواہ
صرف تیس روپیہ کر دی جائے۔

سراج الدولہ نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اہل فوج کی ایک ماہ کی
تنخواہ اپنے ذاتی خزانہ سے ادا کر دی اور فوج والوں کو راضی کر لیا۔ ان سے ایک
دستاویز داخلی ہمدردی کی لکھوائی۔ نواب وزیر الدولہ نے یہ کاغذات ریزیڈنٹ راجستھان
کو بھیج دیئے۔ اتفاقاً اسی زمانہ میں وہ ریزیڈنٹ ولایت چلا گیا، اور اس طرح یہ
معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

۱۸۶۴ء میں نواب وزیر الدولہ کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ نواب محمد علی خاں
مسند نشین ریاست ہوئے۔

مسند نشینی سے متعلق جو مبارکباد وغیرہ مشاورت منعقد ہوا۔ اس کی صدارت
سراج الدولہ نے کی۔ نواب محمد علی خاں مسند نشین ہونے کے بعد اپنے پیر گروہ
کے اسوہ کی پیروی میں سراج الدولہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور نذر پیش
کرتے ہوئے اظہار عقیدت کیا۔

سراج الدولہ نے بطور نقل کہا کہ ریاست میری ہے۔ حضور مرحوم نے اس
کی سند مجھے لکھ دی ہے۔ مگر میں نے تم کو مسند نشین کر دیا۔ یہ بات نواب محمد علی خاں
کو ناگوار گزری اور وہ خاموش واپس آ گئے۔

کچھ عرصہ بعد نواب محمد علی خاں نے احکام جاری کئے کہ اہل فوج کی تنخواہ
کی رقم یک جائی طور پر سراج الدولہ کو نہ بھیجی جایا کرے، بلکہ اسم وار بخشی فوج
سید نور العابدین کے مواجہ میں تقسیم ہوا کرے۔ سراج الدولہ اس تقسیم کے مانع ہوئے
جس سے مزید بدمزگی پیدا ہوئی اور نواب محمد علی خاں کی ناراضگی میں اضافہ ہوا۔ نواب
صاحب نے سید سراج الدولہ کا وظیفہ، ہاتھی، پالکی اور گھوڑے وغیرہ ضبط کر دیا۔

سراج الدولہ نے اپنے ہم زلف صاحبزادہ جمال خاں اور عبداللہ خاں
کے ذریعہ نواب محمد علی خاں سے تعلقات میں ہمواری پیدا کی۔

رسالہ مذکورہ میں درج ہے کہ اس واقعہ کے بعد سید سراج الدولہ ایک
روز نواب محمد علی خاں سے نکلا میں ملے اور عرض کیا کہ حضور کے یہاں روپے کی
ضرورت ہے۔ کچھ روپیہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ نواب صاحب نے اپنے متعدد
چوبدار اور فیلبان ان کے ساتھ کر دیا۔ لیکن بعد میں سراج الدولہ نے روپیہ دینے
سے انکار کر دیا اور اہل خاندان کو نواب محمد علی خاں کے خلاف ابھارنا چاہا۔ بالآخر
نواب محمد علی خاں نے ان کو ٹونک سے جلاوطن کر دیا اور مکان و جائداد سب بحق
سرکار ضبط کر لی گئی۔ مکان کی تلاشی لی گئی تو تین لاکھ روپیہ اور اشرفیاں برآمد ہوئیں
جن کو چھکڑوں میں بار کرکے خزانہ ریاست میں داخل کیا گیا۔

سراج الدولہ ٹونک سے اخراج کے بعد آگرہ پہنچے اور دہلی ریزیڈنسی میں
دادخواہ ہوئے پھر کلکتہ گئے اور دس سال وہاں کوشاں رہے۔ لیکن جب کامیابی
نہیں ہوئی تو جے پور میں اقامت گزیں ہو گئے اور بقیہ عمر وہاں بسر کی۔ آخر میں

نواب ابراہیم علی خاں نے صاحبزادہ احمد یار خاں کی جاگیر سے ان کے بیوی
بچوں کا ایک سو تیس روپیہ وظیفہ کر دیا تھا۔

سراج الدولہ کا انتقال ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ مرزا غالب اس وقت رام پور میں مقیم
تھے اور رام پور ہی میں ان کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو انھوں نے شمشاد بیگ رضوان
کو لکھا:

"ہاں بھئی ٹونک والے سراج احمد کا حال ہمیں بھی لکھو۔"

یہ بات ابھی تحقیق طلب ہے کہ سراج الدولہ سے مرزا غالب کے کب اور کس
طرح تعلقات قائم ہوئے اور شمشاد بیگ رضوان سے سراج الدولہ کی کیا قرابت تھی۔
لیکن یہ بات ضرور ہے کہ غالب کے تعلقات سراج الدولہ سے بہت قریبی
تھے۔ وہ اس واقعہ سے بہت زیادہ متاثر تھے اور نواب محمد علی خاں سے ناراض
ہو گئے تھے۔ اس کی غمازی ان کا وہ خط بھی کرتا ہے جو انھوں نے مولوی محمد حسن خاں
مالک مطبع مدیر اخبار دبدبۂ سکندری کو لکھا ہے۔ خط حسب ذیل ہے۔

"مشفقی و مکرمی محمد حسن خاں صاحب کو غالب آزردہ کا
سلام پہنچے۔ آج مجھ کو آپ کا ایک خط آیا۔ کئی اخبار آپ کے بھیجے
کئی خط آپ کے بھیجے اور آپ اخبار بھیجے جاتے ہیں۔ ابھی آپ کا
خط خط تھا یا کوئی جھوٹ کی پوٹ، بے خبر مجھ پر نالی کی سی بڑ اور جو کچھ
سمجھ میں آیا وہ غلط اور دروغ اور جھوٹ یہ غلط محض ہے کہ مطبع
حضور کا ہے الحمد للہ ثم ... حضور کی طرف سے اللہ اللہ مجھ کو
کی تعریف میں کہیں سارا ایک صفحہ کہیں سارا ایک ورق سیاہ کر گئے
ہو۔ اور اپنے والی ملک اور اپنے بادشاہ یعنی امیر المسلمین نواب کلب علی خاں
بہادر کے نام دکھے دو آنے، یا نام سے پہلے کوئی دو تین لفظ تعظیم
کے لکھتے ہو۔ اور اس قباحت کو نہیں سمجھتے کہ اگر یہ اخبار حضور کی
طرف سے ہے تو گویا مجھ کو کی تعریف بھی حضور کی طرف سے ہو گی
ہندوستانی مملکت میں وہ ایک زمیندار اور سال گزار تھا۔ اب
گورنمنٹ ہند نے اس کو جاگیردار مستقل کر دیا۔ اور نواب محمد علی خاں
رئیس ٹونک کا ہر اخبار میں ایک مرثیہ لکھتے ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوا
کہ تم طرح طرح سے اطراف و جوانب کے رئیسوں سے بھیک مانگتے ہو
بھائی ایک مدیر بلکم گیر، از حضور کے نوکر بھی نہیں ہو تم تو آخر یہ
تم نے یہ کیا ہے۔ اپنے بادشاہ کا ذکر جب کرو کچھ لکھتے ہو کبھی نظر پر
کبھی حاشیہ پر ہم نے ان باتوں سے بے زار ہو کر تمہارا اخبار موقوف
کیا اب پھر نہیں لکھتے ہیں کہ وہ باقی قدر کی رقم جنوری ۱۸۶۸ء سے
دبدبۂ سکندری کا خریدار نہیں ہوں۔ دیکھیو کرو، واسطے خدا کے، نہ
بھیجو، اس سے زیادہ کیا لکھوں۔"

(مرزا غالب ۱۸۶۸ء ۔ ۷ فروری ۱۸۶۸ء)

(مکاتیب غالب ص ۱۳۳)

یہ خط مرزا غالب نے ۱۸۶۸ء میں لکھا ہے۔ جب کہ نواب محمد علی خاں معزول
ہو کر بنارس جا چکے تھے۔ اور اس واقعہ کو ایک سال گزر چکا تھا۔ نواب محمد علی خاں
کی معزولی ۱۸۶۷ء میں لاوہ کے ٹھاکروں کے قتل کے سلسلہ میں ہوئی تھی۔ غالباً
دبدبۂ سکندری میں نواب محمد علی خاں کی ہمدردی میں مدیر اخبار نوٹ لکھا کرتے
ہوں گے۔ جو غالب کو ناگوار گزرتا تھا۔

اور اس سے پہلے نواب محمد علی خاں کی مسند نشینی کے موقع پر بھی غالب نے
ان کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ جس میں اپنی قدیمی نیاز مندی کا اظہار کیا۔

ز غالب کہ از روزگار دراز

بدین عتبہ ساید جبین نیاز

نواب محمد علی خاں کے پدر بزرگوار نواب وزیر الدولہ بھی غالب کے قدردان
تھے اور غالب نے ان کی شان میں دو قصیدے لکھے ہیں۔

سراج الدولہ کے آبا و اجداد بہ عہد عالمگیر بخارا کے ایک ضلع کوہاٹ
سے لاہور آکر اقامت گزیں ہو گئے تھے۔ وہاں سے ان کی اولاد ہندوستان کے
مختلف شہروں میں پھیلی۔

یہ بات بھی ابھی تشنۂ تحقیق ہے کہ سراج الدولہ ٹونک کس طرح اور کس سن
میں آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اجداد میں سے کوئی رام پور بھی آیا اور
رام پور سے یہ خاندان ٹونک پہنچا۔

اس قیاس کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ صاحب تذکرۂ کاملان رام پور
نے صفحہ ۳۰۳ پر میاں غلام مرشد کے حالات کے ذیل میں سراج الدین احمد کے والد
کے نام کے ساتھ رام پوری لکھا ہے۔ تذکرۂ کاملان رام پور کی عبارت یہ ہے۔

"میاں سراج الدین احمد ولد سید احمد رام پوری سے اسی طرح
نواب صاحب (محمد علی خاں) نے تین لاکھ روپیہ وصول کرلے۔
نواب وزیر الدولہ ان کے بھی معتقد تھے۔"

ہماری کتابیں

نام کتاب	قیمت	ڈاک خرچ
پہلا پنچ سالہ پلان (مختصر ایڈیشن)	۲.۵۰ روپے	۵۰ نئے پیسے
آسان پنچ سالہ پلان	۵۰ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے
زمینی اصلاحات کی ترقی	۲۵ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے
سماجی بہبود	۲۵ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے
ٹرانسپورٹ اور پنچ سالہ پلان	۲۵ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے
آپ کا گاؤں اور پنچ سالہ پلان	۵ نئے پیسے	۱۰ نئے پیسے
ہمارے نئے سکے	۲۵ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے
پنچ سالہ پلان، سوالات و جوابات	۲۵ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے
دیہاتی صنعتیں	۲۵ نئے پیسے	۱۲ نئے پیسے

بھیجتے وقت روپیہ یا اس سے زیادہ کی کتابوں پر ڈاک خرچ نہیں لیا جائیگا

قیمت پیشگی اور پوسٹل آرڈر کے ذریعے بھیجنے سے آسانی رہتی ہے

پبلیکیشنز ڈویژن، منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈکاسٹنگ، اولڈ سیکریٹریٹ، دہلی